قراءاتِ قرآنیہ

مستشرقین اور ملحدین کی نظر میں

تالیف: الشیخ عبد الفتاح عبد الغنی القاضی

ترجمہ، تخریج وحواشی: ڈاکٹر محمد اسلم صدیق

تصحیح و نظر ثانی: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر



كلية القرآن الكريم والتربية الاسلامية

ادارۃ الاصلاح ٹرسٹ پاکستان

ابتدائیہ

بلاشبہ قرآن مجید سات حروف میں نازل کیا گیا ہے، جو تواتر، قطعی اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ قراء کرام نے اس حروف کی قراءات کو تلقی وسماع کے خوبصورت اندازِ عمل سے اخذ کیا ہے، جس کی اسانید رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہیں۔ لیکن پاکستان میں بعض لوگ ان قراءات کا انکار کرتے ہیں، جن میں سرفہرست جناب جاوید احمد غامدی صاحب ہیں کہ جن کے قراءات پر اعتراضات کا مفصل جائزہ ہم اپنی کتاب ''فکر غامدی: ایک تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ'' میں لے چکے ہیں۔ یہاں اس بارے صرف ایک واقعے کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کافی عرصہ پہلے راقم کی جناب غامدی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ راقم نے بہت سی باتوں پر غامدی صاحب سے سوالات کیے کہ میں نے آپ کا موقف یوں سمجھا ہے، کیا آپ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ میں نے صحیح سمجھا ہے؟ اکثر اوقات انہوں نے کہا کہ ہاں میرا یہی موقف ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں جبکہ بعض مقامات پر انہوں نے وضاحت بھی کی کہ نہیں، یہ ایسے نہیں ہے بلکہ میں اسے یوں بیان کروں گا۔ لیکن ایک مسئلہ ایسا تھا کہ جس میں مختصر سوالات پر ہی غامدی صاحب کارنر ہو گئے۔ اور وہ یہ تھا کہ میں نے غامدی صاحب سے کہا: آپ روایت حفص کے علاوہ قراءات قرآنیہ کو نہیں مانتے۔ انہوں نے کہا: بالکل ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا: آپ قراءات کو عجمی فتنہ کہتے ہیں اور اسے قرآن نہیں مانتے۔ انہوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا: جو بلادِ مغرب میں مراکش، موریطانیہ، لیبیا، الجزائر اور تیونس میں پڑھا جاتا ہے، وہ آپ کے نزدیک قرآن نہیں ہے کیونکہ وہاں روایت حفص نہیں پڑھی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا: بالکل ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا: امت میں لاکھوں کروڑوں لوگ غیر قرآن کو قرآن سمجھ کر پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: بالکل ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا: آپ کے نزدیک قرآن کیسے ثابت ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا: امت کے اجماع سے۔ میں نے کہا: امت کی اکثریت کو تو قرآن پڑھنا ہی نہیں آتا۔ انہوں نے کہا: امت کے اجماع سے میری مراد ''علماء کا اجماع'' ہے۔ میں نے کہا: جس پر علماء کا اجماع ہو جائے وہ آپ کے نزدیک قرآن ہے۔ انہوں نے کہا: ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا: علماء کا تو اجماع ہے کہ جو بلادِ مغرب میں پڑھا جاتا ہے، وہ قرآن ہی ہے اور یہاں پہنچ کر غامدی صاحب کارنر ہو گئے تھے۔ چونکہ میرا مقصد صرف ان کے موقف کو سمجھنا تھا لہٰذا میں نے اس پر اصرار مناسب نہ سمجھا اور اگلے سوال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے سرگرم جملہ قراء اور علماء کی کاوشوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

قراءاتِ قرآنیہ

مستشرقین اور ملحدین کی نظر میں

تالیف: الشیخ عبدالفتاح عبدالغنی القاضی

ترجمہ تخریج وحواشی: ڈاکٹر محمد اسلم صدیق

تصحیح ونظرثانی: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

کلیۃ القرآن الکریم والتربیۃ الاسلامیۃ

نام کتاب .... قراءاتِ قرآنیہ مستشرقین اور ملحدین کی نظر میں

تالیف .... الشیخ عبدالفتاح عبدالغنی القاضی

ترجمہ تخریج وحواشی .... ڈاکٹر محمد اسلم صدیق

تصحیح ونظرثانی .... ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

ناشر .... کلیۃ القرآن الکریم والتربیۃ الاسلامیۃ

طباعت .... جون 2016ء

کمپوزنگ .... قاری عبدالرشید قمر

ملنے کا پتہ

کلیۃ القرآن الکریم والتربیۃ الاسلامیۃ

ادارۃ الاصلاح ٹرسٹ پاکستان

Mob: 0333-4358421, 0333-4296679
Mob: 0333-4084583, 0300-4306893
Email.quraancollege@hotmail.com
www.quraancollege.com

فہرست

المكتبة الرحمانية

٩٩۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

نمبر ....

مقدمہ

تمام تعریفات اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر اپنی کتاب قرآن کریم نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کجی نہیں رہنے دی۔ اور درود وسلام اللہ کے رسول محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل، صحابہ رضی اللہ عنہم اور آپ ﷺ کے متبعین پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (الحجر: 9)

"بے شک ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

اس کتاب عزیز کی حفاظت چونکہ اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا یہ ہر قسم کی تحریف اور کمی بیشی سے محفوظ رہے گی کہ کتب سابقہ جس سے محفوظ نہ رہ سکیں تھیں۔ سابقہ کتب سماویہ کی حفاظت مخلوق کے سپرد تھی، وہ ان کی حفاظت نہ کر سکی، لیکن قرآن کی حفاظت خود خالق کائنات نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کا یہ ابدی دستور بعینہٖ اسی حالت میں باقی ہے، جس طرح صدیوں قبل رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ آپ ﷺ کی زیر نگرانی اسے چمڑے، ہڈیوں اور کھجور کے پتوں پر اور دور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر دور عثمان رضی اللہ عنہ میں اسے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متفقہ فیصلے سے دو گتوں کے درمیان کتابی شکل میں تحریر کیا گیا تھا۔ آج یہ کتاب اپنے متن، قراءات، رسم، فواصل، غنہ، مد اور طریقہ ادائیگی کے ساتھ پوری طرح محفوظ ہے اور یہ وہ مقام ہے جو انسانی تاریخ میں کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

قراءات قرآنیہ کی اصل بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سات حروف میں نازل فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ كُلُّهُنَّ شَافٍ كَافٍ .)) ❶

"قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جو سب کے سب شافی اور کافی ہیں۔"

❶ سنن النسائی، رقم: 490۔ امام البانی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((فَأَیُّمَا حَرْفٍ قَرَءُوا عَلَیْهِ فَقَدْ أَصَابُوا .)) ❶

"جس حرف پر بھی لوگ اسے پڑھیں گے، بلاشبہ وہ درست ہوگا۔"

سات حروف سے مراد سات وجوہ ہیں، یعنی سات طرح سے قرآن کریم کو پڑھا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ پورا قرآن سات وجوہ پر نازل نہیں ہوا، بلکہ بعض حصے چھ وجوہ پر، کچھ حصے پانچ یا چار یا تین پر، کچھ دو وجوہ پر اور قرآن کا زیادہ تر حصہ ایک ہی وجہ پر نازل ہوا ہے، جس میں قراءات کا کوئی اختلاف مروی نہیں ہے۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ ان میں سے ہر ہر وجہ قرآن ہے، اور لفظ کی ساخت میں تبدیلی کی وجہ سے معنی میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ ان وجوہ میں اختلاف کی نوعیت، تناقض وتضاد کے بجائے تنوع کی ہے۔ اختلافی وجہ مسئلہ کی کسی نئی جہت کو واضح تو کرتی ہے، لیکن تضاد کا شائبہ تک موجود نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کا ایک منفرد اعجاز ہے اور جو شخص بھی توجیہ قراءات کا دقت نظری سے مطالعہ اور ان کے معانی پر غور کرے گا، اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہے گی۔ اس کی مثالیں آپ کو زیر نظر کتاب میں مل جائیں گی۔ لیکن فرنگی مستشرقین اس واضح حقیقت کو کیسے سمجھتے؟ خصوصاً گولڈ زیہر (Ignaz Gold Ziher) جیسا متعصب مستشرق جو وسعتِ مطالعہ کے باوجود دانستہ بددیانتی کا ارتکاب اور حق شناسی کے باوجود ہٹ دھرمی اور ضد کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اور جب اس کی کتاب "مذاهب التفسير الإسلامي" کا ترجمہ منظر عام پر آیا تو ہم نے دیکھا کہ اس میں قرآن کریم کے بارے میں تعصب اور واضح جھوٹ کا رویہ اختیار کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ قرآن میں شدید اختلافات ہیں۔ گولڈ زیہر کی اس خطرناک گمراہی کا سبب یقیناً قراءات سے ناقہمی ہے، یا اس نے محض ضد کی بنا پر دانستہ حقائق سے روگردانی کی ہے۔

---

❶ صحیح مسلم، رقم: 821

عربی ترجمہ کے بعد یہ کتاب عرب دنیا میں پھیل چکی تھی، لہٰذا ضروری تھا کہ فوراً اس کا جواب لکھ کر لوگوں کو اصل حقیقت سے روشناس کروایا جاتا، کیونکہ مسلم معاشروں میں موجود بعض تعلیم یافتہ اور جدت پسند افراد گولڈ زیہر جیسے مغربی مفکرین کے دلدادہ ہیں اور ان کی مغربی سوچ ان کے نظریات اور تصنیفات سے فکری غذا فراہم کرتی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ گولڈ زیہر نے قراءات ایسے مشکل اور نہایت دشوار گزار موضوع پر طبع آزمائی کی جسارت کی ہے، جسے صرف فن قراءت کے ماہر علماء ہی سمجھتے ہیں۔ دار الہجرۃ (مدینہ منورہ) کے یکتائے روزگار عالم امام مالک رحمہ اللہ سے جب ایک شخص نے قراءات کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے باوجود اپنی جلالت شان اور تبحر علمی کے اس شخص کو مدینہ منورہ میں فن قراءت کے جلیل القدر عالم امام نافع رحمہ اللہ کے پاس بھیجتے ہوئے فرمایا:

"كُلُّ عِلْمٍ يُسْأَلُ عَنْهُ أَهْلُهُ"

''ہر علم کے متعلق اس کے ماہرین سے ہی سوال پوچھنا چاہیے۔''

ضروری نہیں ہے کہ علوم اسلامیہ کے ہر میدان میں مغربی مفکرین کی ایسی بے معنی تحقیقات کا جواب دیا جائے اور نہ ہی ہر تحریر کسی تبصرے وتردید کی مستحق ہوتی ہے لیکن علم قراءات کی نزاکتوں سے چونکہ صرف ماہرین فن ہی واقف ہیں، لہٰذا مناسب تھا کہ اس کے بارے مستشرقین کے مغالطوں کو بے نقاب کیا جائے۔

اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں اب تک لکھی گئیں ہیں، ان میں استاذ گرامی الشیخ العلامہ عبد الفتاح القاضی کی یہ کتاب ایک بہترین کاوش ہے۔ مصنف موصوف شعبہ قراءات ،کلیہ القرآن الکریم، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کے چیئرمین اور تصحیح المصاحف کمیٹی مصر، کے صدر ہیں۔ ان کا شمار فن قراءت کے محقق علماء میں ہوتا ہے۔ قرائے کرام کی ایک بڑی تعداد کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ علوم القرآن اور قراءات کے موضوع پر ان کی متعدد تالیفات منظر عام پر آچکی ہیں اور طلباء کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

مصنف موصوف نے ایک ماہر محقق عالم کی طرح واضح اور ٹھوس علمی اسلوب سے گولڈ

زہیر کے شبہات کا جواب دیتے ہوئے قراءات قرآنیہ کے حقائق و اسرار کو واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہر قراءت اپنے اندر ایک معنی رکھتی ہے اور ان کے مابین کوئی تضاد نہیں، بلکہ ایسا معنوی تنوع ہے کہ جس سے قرآن کی فصاحت و بلاغت نمایاں ہوتی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قراءات میں اختلاف کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

((إِنْ قُلْتَ: غَفُورًا رَحِيمًا، أَوْ قُلْتَ: سَمِيعًا عَلِيمًا، أَوْ عَلِيمًا سَمِيعًا فَاللهُ كَذَٰلِكَ، مَا لَمْ تَخْتِمْ آيَةَ عَذَابٍ بِرَحْمَةٍ، أَوْ آيَةَ رَحْمَةٍ بِعَذَابٍ.)) ❶

"تم غَفُوْرًا رَّحِيْمًا کہہ لو، یا سَمِيْعًا عَلِيْمًا کہہ لو، اللہ تعالیٰ اسی طرح ہی ہے، بشرطیکہ تم آیتِ رحمت کا اختتام آیتِ عذاب پر نہ کرو اور آیتِ عذاب کا اختتام آیتِ رحمت پر نہ کرو۔"

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات متعدد اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود تناقض و تضاد سے مبرا ہے، اسی طرح قرآن کریم متعدد وجوہ قراءت کے باوجود تناقض و تضاد سے پاک ہے۔ اگرچہ یہ قراءات تلفظ میں باہم مختلف ہیں، لیکن مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول: "إنما هو كقول أحدكم هلم و تعال و أقبل" میں واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ گرامی قدر استاذ الشیخ عبد الفتاح القاضی کو اس کاوش کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ کتاب شکوک وشبہات کو رفع کرتی اور علم قراءت کی گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قارئین اس کتاب کو انتہائی مفید پائیں گے۔

از...... عبدالعزیز بن عبدالفتاح القاری

ڈین کلیہ القرآن الکریم وعلوم اسلامیہ، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورۃ

22 ربیع الآخر 1402ھ

---

❶ مسند احمد: 35/84، رقم: 21149.

عرضِ مؤلف

ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر اس کے بے حد شکر گزار ہیں۔ اسی سے مدد اور رشد و ہدایت کے خواستگار ہیں اور درود و سلام پیش کرتے ہیں نبی رحمت، آقائے کائنات محمد عربی قرشی ﷺ کی خدمتِ اقدس میں، جن کی بعثت سے خیر و برکات کا چشمہ پھوٹا اور انسانیت اعلیٰ اخلاق سے روشناس ہوئی اور اللہ کی رحمتیں نازل ہوں آپ ﷺ کی آل، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور قیامت تک آنے والے ہر اس انسان پر جو آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلا۔

وبعد!

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود (وزیر محکمہ اوقاف و امور جامعہ ازہر) جب ازہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو انہوں نے مجھے "مذاہب التفسیر الاسلامی" کے عنوان سے ایک کتاب کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ یہ معروف مستشرق گولڈ زیہر (Ignaz Gold Ziher) کی تصنیف تھی اور ڈاکٹر علی حسن عبد القادر اور ڈاکٹر عبد الحلیم النجار نے کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ کتاب کا ابتدائی حصہ قراءات سے متعلق ہے تو سوچا کہ کتاب کا دقتِ نظری سے جائزہ لینا چاہیے، اگر تو یہ ثابت شدہ علمی حقائق پر مشتمل ہے تو اس کی تائید اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے بھرپور جدوجہد کی جائے، تاکہ علم قراءت کے طلباء اور علوم القرآن کے شائقین اس سے استفادہ کر سکیں اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو اس کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، ٹھوس دلائل کے ساتھ بخیہ گری کرتے ہوئے اس کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا جائے اور زیرِ بحث مسائل میں حق بات کو واضح کرتے ہوئے، امت کے درمیان اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے، تاکہ سادہ لوح اور خواہش پرست لوگ کسی دھوکے میں نہ رہیں جو عموماً بازی گر اور نام نہاد متجددین کے دام فریب کا شکار ہو جاتے ہیں، خواہ ان

کی یہ تجدیدی سرگرمی دین سے انحراف اور امت مسلمہ کے اجماع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ میں نے بغیر کسی تعصب اور ادنیٰ زیادتی کے اس کتاب کے مقدمہ کا عمیق جائزہ لیا، اس پر غور وفکر کیا، ایک ایسے مصنف کی نظر سے جو حق کا جویا ہوتا ہے، خواہ جہاں سے بھی ملے، اور راہ صواب کا متلاشی ہوتا ہے، خواہ جہاں بھی اسے جانا پڑے۔ اس ساری تگ و تاز کا محرک کتاب اللہ کے لیے اخلاص، اس کے دفاع کا جذبہ، اور اصل حقائق کو طشت از بام کرنے کی سچی آرزو ہے یا پھر شکوک وشبہات کے اس گرد وغبار کو صاف کرنا مقصد ہے، جسے از اکر مستشرق موصوف نے قرآن کریم کے شفاف چہرے کو دھندلانے اور اس کے مقام کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہو گیا کہ گولڈ زیہر قراءات پر اپنی تحقیق میں جادہ حق سے ہٹ گیا ہے اور اس نے انتہائی جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جا بجا فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے جو ایسے وسیع المطالعہ شخص، جیسا کہ اسکے بعض سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے، کو قطعاً زیبا نہیں تھیں۔

اس کتاب میں ہمارا منہج تحقیق یہ ہے کہ پہلے ہم گولڈ زیہر کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کریں گے، پھر اس پر بحث کرتے ہوئے ٹھوس دلائل کے ذریعے باطل کا پردہ چاک کریں گے کہ حق واضح ہو اور باطل نیست ونابود ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی راہ راست کی طرف راہنمائی کرنے والا اور اس کی توفیق دینے والا ہے۔

خادم القرآن الکریم والعلم
عبد الفتاح القاضی

قراءات کے متعلق گولڈ زیہر کے نظریات

گولڈ زیہر اپنی کتاب کے صفحہ 4 پر لکھتا ہے:

"تاریخ کے اوراق میں کوئی ایسی مذہبی کتاب موجود نہیں ہے، جس کے ماننے والے اسے وحی آسمانی سمجھتے ہوں اور اس کے متن میں اس قدر اضطراب (اختلافات) اور صحیح متن کے تعین میں اس قدر مشکلات کا سامنا ہو، جس قدر کہ نص قرآنی میں ہے۔"

گولڈ زیہر کے نقطہ نظر کا جائزہ:

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی متن میں نہ کوئی اضطراب ہے اور نہ ہی اس کے صحیح متن کے تعین میں کسی مشکل کا سامنا ہے۔ اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ قرآن کریم کے متن میں کبھی کوئی اختلاف جگہ پا سکے، کیونکہ قرآنی متن میں اضطراب اور اس کے صحیح متن کی تعیین میں مشکل کا سامنا تو تب ہوتا کہ نص قرآنی کو مختلف وجوہ اور متعدد صورتوں میں پڑھا جائے اور یہ تمام صورتیں معنوی اعتبار سے باہم متناقض اور متضاد ہوں اور ان کے مفہوم اور مدعا میں واضح تعارض (Contradiction) ہو اور پھر یہ پہچاننا بھی مشکل ہو جائے کہ ان صورتوں میں کون سی صورت وحی ہے اور کون سی وحی نہیں ہے۔ قرآن کریم کے بارے میں یہ مفروضہ قطعی محال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نص قرآنی کے سلسلے میں جو قراءات اور وجوہ وارد ہوئی ہیں، ان کے درمیان کوئی تضاد ہے اور نہ ان کے معانی اور مدعا کے درمیان کوئی تعارض ہے، بلکہ وہ ایک دوسرے کی تائید اور توضیح کرتی ہیں۔ اگر آپ متواتر، مشہور اور صحیح قراءات کا جائزہ لیں تو ان کے درمیان صرف دو قسم کا اختلاف ملے گا:

پہلی قسم:

دو قراءات تلفظ میں تو مختلف ہیں، لیکن دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ اس کی مزید دو صورتیں ہیں:

① بعض کا تعلق لغات کے اختلاف سے ہے، مثلاً: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ﴾ (الفاتحۃ: 6) اس میں سین اور صاد کے ساتھ دو قراءتیں ہیں، لیکن دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسی طرح ﴿وَيَـأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ (النساء: 37) یہاں ﴿بِالْبُخْلِ﴾ میں دو قراءتیں ہیں: ایک باء کی پیش اور خاء ساکن کے ساتھ اور دوسری باء اور خاء کی فتح کے ساتھ، لیکن دونوں کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اسی طرح ﴿يَحْسَبُ﴾ (الھمزۃ: 3) میں سین کی فتح (زبر) اور کسرہ (زیر) کے ساتھ اور ﴿مِرْفَقًا﴾ (الکھف: 16) میں ایک قراءت میم کے کسرہ (زیر) اور فاء کی فتح (زبر) کے ساتھ اور دوسری میم کی زبر اور فاء کی زیر کے ساتھ ہے، لیکن دونوں قراءات کا مفہوم ایک ہی ہے۔ قراءت کی اس قسم کو قرآن میں نازل کرنے کا مقصد اور حکمت مختلف اہل لغات کے لیے تلاوت میں آسانی بہم پہنچانا تھا۔

② دوسری صورت ان قراءات کی ہے جن میں لغات کا اختلاف تو نہیں ہے، البتہ فصیح عربی زبان میں انہیں ایک سے زیادہ وجوہ (طریقوں) پر پڑھا جا سکتا ہے، جیسا کہ:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ﴾ (الشعراء: 193) یہاں "نَزَلَ" میں زاء کی تخفیف، "الرُّوْحُ" میں حاء کی رفع (پیش) اور "الْأَمِيْنُ" میں نون کی رفع (پیش) کے ساتھ بھی قراءت جائز ہے اور "نَـزَّلَ" میں زاء کی تشدید، "الـرُّوْحَ" میں حاء کی نصب (زبر) اور "الْأَمِيْنَ" میں نون کی نصب (زبر) کے ساتھ بھی جائز ہے۔ اس کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو کہ ﴿أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ (الزخرف: 18) میں لفظ "يُنَشَّؤُا" کو یاء کے ضمہ (پیش)، نون کے فتح (زبر) اور شین کی شد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یاء کی فتح، نون

ساکن اور شین کی تخفیف کے ساتھ "یَنْشُزُوْا" بھی پڑھا گیا ہے۔

اور جیسے: ﴿لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا﴾ (یس: 10) کو تاء مخاطب اور یائے غائب کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

اور جیسے: ﴿وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ﴾ (الذاریات: 46) میں لفظ "قَوْمَ" کو میم کی زیر اور زبر کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

معانی اور الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ہی لفظ کو مختلف انداز سے پڑھنا اہل عرب کے دستور کے مطابق ہے، بشرطیکہ گفتگو میں پیش نظر مفہوم مجروح نہ ہو۔ نیز اس میں ایک ہی حرف کے دائرہ میں محدود نہ ہونے کے سبب سے قاری کے لیے وسعت بھی پیدا ہو جاتی ہے، خاص طور پر اس وقت تو یہ بات انتہائی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے جب کسی شخص کو اپنی طرف سے قرآن کریم کے کسی لفظ میں تبدیلی کی اور حامل وحی سے سنی ہوئی قراءت سے انحراف کی اجازت نہ ہو۔

دوسری قسم:

دوسری قسم ان قراءات کی ہے کہ دو قراءاتیں تلفظ کے اختلاف کے ساتھ ساتھ معنی میں بھی مختلف ہیں، لیکن دونوں کے معنی میں کوئی تضاد اور تعارض (Contradiction) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہی چیز کے دو مختلف پہلو ہیں، دونوں معنی کے درمیان تطبیق (Adjustment) ممکن ہے، مثلاً: ﴿وَ انْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ (البقرۃ: 259) اسے زاء کے ساتھ "نُنْشِزُهَا" بھی پڑھا گیا ہے، جس کا معنی ہے: ''ہم ان کو آپس میں ملائیں گے۔'' اور اسے راء کے ساتھ "نُنْشِرُهَا" بھی پڑھا گیا ہے، جس کا معنی ہے: ''ہم انہیں موت کے بعد حساب کے لیے زندہ کریں گے۔'' اس میں دونوں معانی بظاہر مختلف ہیں، لیکن ان کے درمیان کوئی تناقض اور تضاد نہیں ہے، بلکہ دونوں کا معنی ملتا جلتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جب مخلوق کو دوبارہ اٹھانا چاہے گا تو ان کی ہڈیوں کو باہم ملائے گا اور اس کے بعد انہیں جزاء و سزا کے لیے زندہ کرے گا۔ ایک اور مثال دیکھئے کہ ﴿اِنَّ

الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ﴾ (الحدید : 18) یہاں دونوں کلمات میں ایک قراءت صاد کی تشدید کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں کلمات اصل میں "المتصدقین" اور "المتصدقات" تھے۔ پھر تاء کو صاد سے بدلا اور صاد کو صاد میں مدغم (Diphthong) کر دیا گیا۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اپنی دولت میں سے فرض صدقہ (زکوۃ) یا مستحب صدقہ نکالتے ہیں۔

اور دوسری قراءت ان میں صاد کی تخفیف (جزم) کے ساتھ ہے اور مراد وہ لوگ ہیں "جو دین کے پابند اور ان کے دل اسلام کی اطاعت اور اس کے احکام کی بجا آوری کے جذبہ سے لبریز ہوں۔" دونوں قراءات کا مفہوم بظاہر مختلف ہے، لیکن درحقیقت وہ ایک مومن انسان کی سیرت کے گوناگوں پہلوؤں کو نمایاں کر رہی ہیں۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو کہ ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا﴾ (البقرۃ: 36) میں ایک قراءت، زاء کے بعد حذف الف اور لام کی تشدید کے ساتھ "فَاَزَلَّهُمَا" ہے۔ معنی یہ ہے کہ "شیطان نے ان دونوں (آدم وحوا) کو غلطی میں ڈال دیا۔"

اور دوسری قراءت زاء کے بعد الف کے اثبات اور لام کی تخفیف (جزم) کے ساتھ "فَاَزَالَهُمَا" ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ "شیطان نے آدم وحوا کو جنت سے دور کر دیا۔"

یہاں مفہوم میں بظاہر تغایر ہے، لیکن حقیقت میں دونوں معنی لازم وملزوم ہیں، کیونکہ آدم وحوا کا غلطی میں مبتلا ہونا ہی دراصل ان کی جنت سے محرومی کا باعث ہوا تھا۔ گویا لغزش کا ارتکاب سبب ہے اور جنت سے علیحدگی اس کا نتیجہ ہے۔ قراءات میں اس قسم کے اختلاف کا مقصود درحقیقت قرآن کریم میں اختصار کے ساتھ جامعیت پیدا کرنا تھا کہ ایک ہی آیتِ قرآنی سے دو آیتوں کا کام لیا جائے اور کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کا حصول ممکن ہو سکے۔

باقی جہاں تک تعلق ہے کسی لفظ میں دو ایسی قراءات کے وجود کا، جن کا مفہوم باہم متضاد ہو اور ان کا مدعا باہم مختلف ہو، تو قرآن کریم میں اس کا نام ونشان تک نہیں ہے، اور ایسا ہونا قطعاً محال ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء: 82)

''اگر قرآن کریم اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے (نازل) ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے''

ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "مشکل القرآن" میں لکھا ہے:

''اختلاف کی دو قسمیں ہیں: ① اختلاف تغایر اور ② اختلاف تضاد۔ اختلاف تضاد تو ممکن نہیں ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ کتاب اللہ میں اس کی ایک بھی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ ہاں البتہ اختلاف تغایر ممکن ہے۔''

اس کے بعد ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے قرآن سے اس قسم کے اختلاف کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دونوں میں ہر معنی اپنی جگہ پر بالکل درست، ہر قراءۃ ایک مستقل آیت کے قائم مقام اور قراءات کا یہ اختلاف بلاشبہ فنی اعجاز کا ایک شاہکار ہے جسے قرآن نے اپنے احکام اور تعلیمات کے پیرایہ بیان میں اختیار کیا ہے۔

الغرض قراءات میں اختلاف کی نوعیت تنوع اور تغایر کی ہے، تعارض اور تناقض کی قطعاً نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی عقل مند اور ذی ہوش انسان ایک ہی موقعہ پر باہم متعارض گفتگو نہیں کرتا تو پھر اللہ تعالیٰ جو پوری انسانیت کا رب ہے، اس کے کلام میں تناقض کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ان واضح حقائق کے بعد بہر حال یہ ماننا پڑتا ہے کہ تاریخ انسانی میں قرآن کریم ہی وہ واحد الہامی کتاب ہے جس کے متن کے تعین میں کسی الجھن اور نص میں کسی اضطراب کا تصور بھی محال ہے۔

علاوہ ازیں نص قرآنی اور قراءات کے سلسلے میں جن روایات پر اعتماد کیا گیا ہے، وہ بذریعہ تواتر ہم تک پہنچی ہیں اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف ان قراءات کی نسبت قطعی ذریعہ سے ثابت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد نے ان قراءات کو رسول اللہ ﷺ سے بالمشافہ حاصل کیا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعین کے ایک بڑے جم غفیر نے ان قراءات کو براہ راست سنا اور ان تابعین سے تبع

تابعین کی ایک بڑی تعداد نے حاصل کیا۔ پھر عالم اسلام کے ہر علاقہ، ہر دور اور ہر نسل میں ایک جم غفیر کو لیے ہوئے یہ سلسلہ آخر کار ہم تک پہنچا۔ اس قدر شاندار اور کڑے نظام کی موجودگی میں کیا نص قرآنی میں کسی ادنیٰ درجہ کے تغیر اور اضطراب کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟

گولڈ زیہر اپنی کتاب کے صفحہ 5 پر لکھتا ہے:

"اسلامی تاریخ کے قدیم ادوار میں نص قرآنی کی وحدت (اکائی) کے عقیدہ کی طرف رجحان کو بہت ہی کم پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔"

گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ میں سے ایک گروہ نص قرآنی کی اکائی کا عقیدہ رکھتا ہے، لیکن یہ عقیدہ اپنے لیے کوئی بڑی تائید حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

گولڈ زیہر کے نقطۂ نظر کا جائزہ:

گولڈ زیہر کی یہ سخن سازی اپنی پشت پر کوئی دلیل نہیں رکھتی، بلکہ ایسے ٹھوس حقائق موجود ہیں جو اس تخیل کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ نص قرآنی کا یہ نظریہ محض گولڈ زیہر کی ذہنی اختراع ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ کسی مسلمان کے دل میں اس نظریہ کا خیال بھی آیا ہو۔ اگر اس کا کوئی وجود ہوتا تو تاریخ بھی اس کو نظر انداز نہ کرتی، اور ہم تک ضرور پہنچتا۔ باقی رہا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام کہ انہوں نے مصاحف کی کتابت کروائی اور انہیں بلاد اسلامیہ کی طرف روانہ کیا اور تمام مسلمانوں کو ان کی پابندی پر آمادہ کیا، تو اس کا باعث قطعاً یہ نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں کو ایک ہی نص قرآنی پر جمع کرنا چاہتے تھے، بلکہ اس کا محرک عالم اسلام کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت قراءات متواترہ پر جمع کرنا اور ان تمام قراءات کو قرآن سے الگ کرنا تھا جو امت کی آسانی کے پیش نظر عبوری دور کے لیے نازل ہوئی تھیں، پھر عرضۂ اخیرہ ❶ میں منسوخ کر دی گئیں، لیکن

❶ جبریل علیہ السلام ہر سال رمضان کے مہینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سناتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل کو سناتے۔ قرآن کریم کے دور کا یہ سلسلہ ابتدائے وحی سے متواتر ۲۳ سال تک جاری رہا۔ اور اپنی زندگی کے آخری سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دفعہ جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا یہ دور کیا، جسے عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے۔

ان کے منسوخ ہونے سے لاعلم بعض حضرات ان قراءات کو بعد میں بھی پڑھتے رہے۔

نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ان مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رسم الخط پر تحریر کرنے کا مقصد یہی تو تھا کہ عرضہ اخیرہ کے وقت موجود تمام وجوہ قراءات پر امت کو جمع کیا جا سکے اور تمام قراءات شاذہ ❶ اور منسوخہ کو ہمیشہ کے لیے قرآن سے الگ کر دیا جائے۔

اس حقیقت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے جو مصاحف مرتب کئے گئے تھے ان کے مابین قراءات قرآنیہ کی مناسبت سے متعدد کلمات میں اختلاف تھا، ❷ جیسا کہ قراءات اور رسم القرآن کے موضوع پر مبنی کتب سے واضح ہے۔

اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقصد امت کو ایک ہی نص قرآنی (قراءۃ) پر جمع کرنا ہوتا تو تمام مصاحف کو ایک ہی شکل میں لکھواتے اور ان کے درمیان کسی بھی قسم کا اختلاف نہ ہوتا۔ چنانچہ مصاحف عثمانیہ کے درمیان بعض کلمات کے رسم میں اختلاف اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیش نظر امت کو ایک نص قرآنی پر نہیں، بلکہ ان قراءات پر جمع کرنا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بذریعہ تواتر ثابت تھیں۔

گولڈزیہر صفحہ 8 پر لکھتے ہیں:

''ان اختلافات (قراءات) کے ایک بڑے حصہ کے وجود میں آنے کا سبب عربی رسم الخط کی خاصیت ہے۔ اس رسم الخط کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی کلمہ کے ایک ہی ڈھانچہ کو اوپر، نیچے موجود نقطوں کے لحاظ سے مختلف طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ نیز عربی رسم الخط کے نقطوں اور حرکات (زبر، زیر، پیش) سے خالی ہونے کی وجہ سے ایک ہی کلمہ کو اعراب کی مناسبت سے مختلف انداز سے پڑھنا ممکن ہے۔ تو رسم مصحف چونکہ نقطوں اور حرکات سے خالی تھا، جو بعد ازاں

---

❶ اصطلاح میں قراءات شاذۃ سے مراد، وہ قراءات ہیں جن کا رسم مصحف امام کے رسم سے مختلف ہو۔ وہ الطریق آحاد مروی ہوں، خواہ وہ سنداً صحیح ہوں یا ضعیف۔ لغت عربی کے مطابق ہوں یا مخالف۔

❷ ایسی قراءات جنہیں ایک رسم کے تحت لکھنا ممکن نہیں تھا، انہیں تمام مصاحف میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

تحریک قراءات کے وجود کا باعث بنا۔“

اس سلسلے میں گولڈ زیہر نے درج ذیل پانچ مختلف قراءات بطور مثال پیش کی ہیں، جو اس کے خیال میں مصاحف کے نقطوں سے خالی ہونے کی وجہ سے وجود میں آئیں:

① ﴿وَنَادَىٰ أَصْحَٰبُ ٱلْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُم بِسِيمَىٰهُمْ قَالُوا۟ مَآ أَغْنَىٰ عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ﴾ (الأعراف: 48)

اس آیت میں "تَسْتَكْبِرُونَ" کو بعض نے باء کی بجائے ثائے مثلثہ کے ساتھ "تَسْتَكْثِرُونَ" پڑھا ہے۔

② ﴿وَهُوَ ٱلَّذِى يُرْسِلُ ٱلرِّيَٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهِۦ﴾ (الأعراف: 57)

اس میں لفظ "بُشْرًا" کو باء کی بجائے نون کے ساتھ "نُشْرًا" بھی پڑھا گیا ہے۔

③ ﴿وَمَا كَانَ ٱسْتِغْفَارُ إِبْرَٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَآ إِيَّاهُ﴾

(التوبة: 114)

بعض قراء نے اس میں لفظ "إِيَّاهُ" کو ہمزہ کے کسرہ (زیر) اور یاء مشددہ کے بجائے ہمزہ کے فتح (زبر) اور باء کے ساتھ "أَبَاهُ" پڑھا ہے۔

④ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا ضَرَبْتُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَتَبَيَّنُوا۟﴾ (النساء: 94)

ثقہ قراء کی ایک جماعت نے اس میں "فَتَبَيَّنُوا" کو باء کی بجائے ثاء کے ساتھ "فَتَثَبَّتُوا" پڑھا ہے۔

اس کے بعد گولڈ زیہر لکھتا ہے کہ درج بالا قراءات کے مابین اس قسم کے اختلافات سے عام مفہوم اور فقہی مسائل میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

⑤ ﴿فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَٱقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ﴾ (البقرة: 54)

گولڈ زیہر کا دعویٰ یہ ہے کہ

”مذکورہ آیت درحقیقت سفر الخروج فصل 32، فصلۃ 27 کے بالکل مطابق ہے

جو کلمات قرآنیہ کا اصل مصدر ہے۔ ❶ اور قدیم مفسرین کی ایک معتد بہ تعداد جن میں امام قتادہ متوفی (117ھ،735م) سرفہرست ہیں، نے سوچا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنا یا ان میں سے گناہ گاروں کو قتل کرنا چونکہ سنگدلی ہے اور یہ سزا ان کی غلطی سے مناسبت نہیں رکھتی تو انہوں نے خاموش حروف کے رسم کو بدل کر اوپر کے دو نقطوں کو نیچے منتقل کر کے "فاقیلوا" پڑھ دیا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ''جس گناہ کا تم نے ارتکاب کیا ہے، اس پر ندامت کے ساتھ معافی مانگو۔'' یہ مثال فی الواقع اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ اختلاف قراءات کے اسباب میں سے ایک سبب معروضی حالات بھی تھے۔ اس کے برعکس سابقہ مثالوں میں اختلاف قراءات کا باعث وہ تکنیکی اور فنی وجوہات ہیں، جن کا تعلق رسم مصحف سے ہے۔''

گولڈ زیہر نے مزید لکھا ہے کہ

''معلوم یہ ہوتا ہے کہ سورۃ الفتح کی آیت نمبر 8 اور 9 میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝﴾ (الفتح: 8-9) اس میں راء کے ساتھ "تُعَزِّرُوْهُ" ہے۔ جس کا معنی ہے "تم اس کی مدد کرو۔" اس کو بعض نے زاء کے ساتھ "تُعَزِّزُوْهُ" پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے کہ "تم اس کی تعظیم کرو۔" کچھ بعید نہیں کہ متن میں اس تبدیلی کی وجہ یہ اندیشہ ہو کہ کہیں قرآن کی اس آیت سے یہ مفہوم نہ اخذ کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں سے اعانت کا طلب گار ہے۔ ہاں البتہ قرآن کی سورۃ الحج، آیت:40، سورۃ محمد،

❶ یہ قرآن کریم پر بہتان ہے۔ تورات، انجیل، قرآن اور تمام الہامی کتابوں کا اصل سرچشمہ اور مصدر درحقیقت لوح محفوظ ہے اور خود مستشرق موصوف نے کتاب کے شروع میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

آیت: 17، سورۃ الحشر آیت: 8 میں "سینصر" اور "من ینصر" جیسے الفاظ آئے ہیں۔"

اس کے بعد گولڈ زیہر نے بطور مثال ان قراءات کا ذکر کیا ہے جو اس کے خیال میں مصاحف کے نقطوں اور حرکات سے خالی ہونے کی وجہ سے وجود میں آئیں۔ اس نے سورۃ الحجر کی آیت ﴿وَمَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ﴾ کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

"فرشتوں کے نزول پر دلالت کناں اس لفظ کے متعلق قراء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ لفظ "تُنَزَّلُ" ہے یا "تَنَزَّلُ" یا "تُنْزَلُ" ہے۔ یہ تمام قراءات مختلف علاقوں کی نمائندہ قراءات ہیں اور ہر کلمہ اپنے مناسب حال معنی دے رہا ہے۔"

وہ مزید لکھتا ہے کہ

"حرکات کا یہ اختلاف بعض دفعہ معنوی اعتبار سے نہایت دور از کار تبدیلیوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الرعد کی آیت: ﴿وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ ہے۔ اس جملہ میں درج ذیل قراءت بھی وارد ہوئی ہے: ﴿وَمِنْ عِنْدِهٖ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ اور اسی میں حرکت کی تبدیلی نے ایک اور قراءت: ﴿وَمِنْ عِنْدِهٖ عُلِمَ الْكِتٰبُ﴾ کو جنم دیا۔"

گولڈ زیہر کا سرمایہ تحقیق ختم ہوا، اب اس پر ہمارا تجزیہ ملاحظہ ہو۔

گولڈ زیہر کے نزدیک اختلاف قراءات کے اسباب اور اس کی تردید:

گولڈ زیہر نے اپنے اس طویل اقتباس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قراءات میں اختلاف کا سبب اور ایک لفظ میں متعدد قراءات کی بنیاد عربی رسم الخط کی وہ خصوصیت تھی، جس میں مصاحف عثمانیہ کو تحریر کیا گیا تھا۔ نقطے جو حروف کی پہچان کا ذریعہ ہیں اور حرکات جو حروف کے اعراب کو ظاہر کرتی ہیں رسم عثمانی ان سے خالی تھا۔ چنانچہ جب قرآنی کلمات کو مصاحف میں نقطوں اور حرکات کے بغیر لکھا گیا تو ان میں متعدد قراءات اور ایک لفظ کو مختلف

طریقوں سے پڑھنے کا احتمال پیدا گیا۔اور ہر قاری کو یہ اختیار تھا کہ اپنے ذوق نظر اور اطمینان قلب کے مطابق جس کو چاہے منتخب کرے۔گویا اس کے خیال میں قراءات کا یہ اختلاف توقیفی یا سند وروایت پر مبنی نہیں بلکہ قراء کی ذاتی رائے اور اجتہاد کا نتیجہ ہے۔اس کے خیال میں یہ قراءات رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں نہ وحی الٰہی کا ان میں کوئی دخل ہے۔اس کی رائے میں ان قراءات کے پیچھے درج ذیل دو اسباب کار فرما ہیں: (اول) مصاحف عثمانیہ میں حروف کا نقطوں سے خالی ہونا۔ (دوم) مصاحف میں حروف کا لغوی اور نحوی حرکات سے خالی ہونا۔

گولڈ زیہر کی رائے کا تجزیہ:

مستشرق موصوف کا یہ دعویٰ دلائل سے سراسر عاری، ظن وتخمین کا نتیجہ اور محض جھوٹ اور افتراء کا پلندہ ہے۔گولڈ زیہر نے بڑی دیدہ دلیری سے مسلمانوں کی مقدس ترین متاع کتاب اللہ عزوجل کو ہدف تہمت بنایا ہے تاکہ لوگوں کا اعتماد ویقین اس سے اٹھ جائے اور انہیں اس شک میں مبتلا کر دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب غور وفکر اور تحقیق ودریافت کا میدان ہے نہ اس کے الفاظ،قراءات، روایات اور طرق ادا اور ضبط وثقاہت کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موصوف کی یہ رائے تاریخی حقائق سے متصادم اور تواتر سے ثابت ان نقلی دلائل کے خلاف ہے کہ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قراءات کا سرچشمہ وحی الٰہی اور ان کی اتباع کی اصل بنیاد وہ نقل صحیح ہے جو خلف وسلف سے ہوتی ہوئی رسول اللہ ﷺ تک اور پھر جبریل امین علیہ السلام اور ذات باری تعالیٰ تک پہنچتی ہے۔بلکہ یہ رائے عقلی مقدمات کے منافی، منطقی اصولوں سے متصادم اور پختہ فکر سلیم اسے تسلیم کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ زیر نظر سطور میں چند تاریخی حقائق اور نقلی وعقلی دلائل پیش کئے جا رہے ہیں جو اس خیال خام کی اصلیت کو واضح کر دیں گے۔

پہلی دلیل:

تاریخ و روایت جس کی گواہی بہترین اور اس کی خبر سب سے بڑھ کر سچی ہے، کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں تدوین مصاحف سے قبل بھی اپنی تمام تر قراءات اور روایات کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اور قرآنی قراءات وروایات کا معاملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں معروف تھا۔ وہ جانتے تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان ساتوں حروف کے مطابق قرآن کی قراءت کرتے رہے۔ یہ ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ صحیح احادیث اور صریح آثار اس پر شاہد عدل ہیں، جن کی اسانید ہر قسم کے سقم اور تنقید سے مبرا ہیں۔ ذیل میں ہم وہ متواتر اور قطعی احادیث پیش کر رہے ہیں تاکہ شک وشبہ کی گرد چھٹ جائے اور یہ حقیقت پوری طرح مبرہن ہو جائے کہ قراءات کا تمام تر دارومدار روایت اور سماع پر تھا۔ تعدد قراءات اور اختلاف قراء میں کسی بھی فرد و بشر کو ذرا دخل تھا، نہ اس رسم عربی کا اس میں کوئی کردار تھا کہ جس میں یہ مصاحف لکھے گئے تھے۔

حدیث نمبر 1

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَقْرَأَنِي جِبْرِيلُ عَلَى حَرْفٍ فَرَاجَعْتُهُ، فَلَمْ أَزَلْ أَسْتَزِيدُهُ وَيَزِيدُنِي حَتَّى انْتَهَى إِلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) [1]

''جبریل علیہ السلام نے مجھے قرآن کریم ایک حرف کے مطابق پڑھایا۔ تو میں ان سے برابر تکرار کرتا رہا اور ان سے زیادہ حروف کا مطالبہ کرتا رہا اور وہ اللہ سے حکم پا کر حروف کو بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ سات حروف تک پہنچ گئے۔''

حدیث کے بعض الفاظ کی تشریح:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ''فَرَاجَعْتُهُ'' کی تشریح صحیح مسلم کی اس حدیث

---

[1] صحیح بخاری، رقم: 4991 صحیح مسلم، رقم: 819.

سے ہوتی ہے:

((فَرَدَدْتُ إِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلَى أُمَّتِي وَإِنَّ أُمَّتِي لَا تُطِيقُ ذَلِكَ)) ❶

''میں ان سے برابر تکرار کرتا رہا کہ میری امت پر آسانی فرمایئے۔اس میں میری امت کو بڑی دقت ہوگی۔''

اور "فَلَمْ أَزَلْ أَسْتَزِيدُهُ......"کا مفہوم یہ ہے کہ میں مسلسل جبریل علیہ السلام سے یہ مطالبہ کرتا رہا کہ میری امت پر آسانی، توسیع اور رحمت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مزید حروف کی درخواست کریں۔ بالآخر اللہ سبحانہ سے برابر درخواست کے نتیجے میں حروف کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔

حدیث نمبر 2

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔جب میں نے ان کی قراءت پر غور کیا تو میں نے سنا کہ وہ متعدد ایسے حروف پر قراءت کر رہے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔قریب تھا کہ میں نماز میں ہی ان کو پکڑ لیتا، لیکن میں نے صبر کیا۔جب انہوں نے سلام پھیر لیا تو میں نے ان کے گلے میں چادر ڈال کر پوچھا: آپ کو یہ سورت اس طرح کس نے پڑھائی ہے، جیسا کہ میں نے آپ کو پڑھتے ہوئے سنا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ سورت اسی طرح پڑھائی ہے۔میں نے کہا: تم غلط کہہ رہے ہو، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت دوسری طرح پڑھائی تھی، نہ کہ جیسا تم پڑھ رہے ہو۔چنانچہ میں انہیں پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نے انہیں ایسے حروف پر قرآن پڑھتے ہوئے سنا ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے چھوڑ دو۔اور ہشام سے کہا: تم پڑھو۔تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسی طرح پڑھا جیسا کہ میں نے انہیں

❶ صحیح مسلم، رقم: 820، 821۔

پڑھتے ہوئے سنا تھا۔تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ اب تم پڑھو۔تو میں نے وہ قراءت پڑھی جو آپ ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی۔تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كَذٰلِكَ أُنْزِلَتْ ، إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ ، فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ .)) [1]

''اسی طرح نازل ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے جو تمہیں آسان معلوم ہو، وہ پڑھ لو۔''

حدیث کے بعض الفاظ کی تشریح:

((فَكِدْتُ أُسَاوِرُهُ فِي الصَّلَاةِ))

یعنی''قریب تھا کہ میں نماز میں ہی ان سے لڑ پڑتا اور انہیں سر سے پکڑ لیتا۔''

((فَتَصَبَّرْتُ حَتّٰى سَلَّمَ))

یعنی''میں نے بمشکل صبر کیا اور ہشام کو سلام پھیرنے اور نماز سے فارغ ہونے کی مہلت دے دی۔''

((فَلَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهِ)) کا مطلب یہ ہے کہ''میں نے اپنی چادر ان کی گردن میں ڈال دی تاکہ چھڑا کر بھاگنا ان کے لیے ممکن نہ رہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ''یہ لفظ السلبة سے ماخوذ ہے،اس سے مراد گردن کا وہ حصہ ہے جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔ یعنی میں نے اپنی چادر کو ان کی گردن میں ڈال کر کھینچا،تاکہ انہیں اچھی طرح قابو کرلوں۔اس واقعہ سے بخوبی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دفاع قرآن اور اس کے ایک ایک لفظ کی حفاظت کے معاملے میں کس قدر سخت اور حساس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے قرآن کو حرف بحرف اس طرح محفوظ کیا،جس طرح انہوں نے رسول اللہ ﷺ

[1] صحيح بخاری، رقم 4992۔ صحيح مسلم، رقم 818

سے سنا تھا۔"

اور تاریخ شاہد ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ حق کے معاملے میں سخت، دین کے معاملے میں انتہائی غیرت مند اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے معاملے میں پختہ عزم اور بلند حوصلہ کے مالک انسان تھے۔ اسی لیے انہوں نے ہشام رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ سخت رویہ اختیار کیا، کیونکہ ان کا غالب گمان یہ تھا کہ ہشام نے قراءت میں غلطی کی ہے۔ اور اپنی طرف سے ایسی قراءت وضع کی ہے جو شاید انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مؤاخذہ نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ ان کا اجتہاد تھا۔ اس سخت رویہ کے پیچھے درحقیقت قرآن کریم کے دفاع اور اس کی حفاظت کا جذبہ تھا۔ اور یہ خدشہ ان کے پیش نظر تھا کہ کہیں کوئی تصحیف وتبدیلی قرآن میں راہ نہ پا جائے۔

رہا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہشام رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا کہ ((کذبت)) تو اس بارے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے غالب خیال کی بنیاد پر ایسا کہا۔ یا پھر کذب یہاں غلطی کے معنی میں ہے، کیونکہ اہل حجاز کے ہاں کذب کا لفظ غلطی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ "مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ سورت دوسری طرح پڑھائی تھی، نہ کہ جیسا تم پڑھ رہے ہو اور تم نے قراءت میں غلطی کی ہے۔" انہوں نے یہ استدلال اپنے اجتہاد اور غالب خیال کی بنیاد پر کیا تھا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ سبقتِ اسلام کی وجہ سے انہیں حفظ قرآن میں زیادہ دسترس حاصل ہے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سبقت اسلام اور قرآن کے ساتھ والہانہ لگاؤ کی وجہ سے، جتنا قرآن یاد تھا، وہ انہیں ازبر تھا اور اس کا ثبوت یقینی تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ان کے درمیان اختلاف کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ سورت بہت پہلے رسول اللہ ﷺ سے حفظ کی تھی اور اس

میں جو حروف بعد میں نازل ہوئے، وہ انہوں نے نہیں سنے تھے۔ ہشام رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں وہ پڑھایا تھا جو آخری دور میں نازل ہوا تھا۔ یہ چیز ان کے درمیان اختلاف کا باعث ہوئی۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے فوری ردعمل ظاہر کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید انہوں نے اس واقعہ سے قبل حدیث: ((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) نہ سنی ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ "انہیں (ہشام) چھوڑ دو"۔ آپ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ کو یہ حکم اس لیے دیا تھا تاکہ ان کے دعویٰ کے جواب میں ہشام رضی اللہ عنہ کا موقف بھی سنا جائے۔ یا اس لیے کہ ہشام رضی اللہ عنہ کے دل سے یوں گردن میں چادر ڈال کر لائے جانے کا رنج زائل ہو جائے اور وہ پورے اطمینان سے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی قراءت پیش کر سکیں۔ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قراءت کا حکم دینے کے پیش نظر آپ کا یہ خدشہ تھا کہ کہیں ہشام کی بجائے ان کی قراءت میں ہی غلطی نہ ہو۔

اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: ((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) کا مقصد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو تسلی دینا، اور ان کے اس اضطراب اور پریشانی کو رفع کرنا تھا، جو آپ ﷺ کی طرف سے عمر رضی اللہ عنہ اور ہشام رضی اللہ عنہ دونوں کی قراءت کو باہم اختلاف کے باوجود درست قرار دینے کے باعث انہیں لاحق ہو سکتی تھی۔ گویا مقصد انہیں یہ باور کروانا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سات حروف پر نازل کیا ہے۔ معجم طبرانی کی ایک روایت میں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو قراءت کرتے ہوئے سنا، اس کی قراءت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قراءت سے مختلف تھی۔ نزاع کا یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوا۔ اس آدمی نے عرض کی: اللہ کے رسول ﷺ، کیا آپ ﷺ نے مجھے یوں ہی نہیں پڑھایا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل ایسے ہی پڑھایا تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے چہرے پر قلق اور پریشانی کے آثار ہیں۔ تو فرمایا: اے اللہ! ان سے شیطان کو دور کر دے۔ پھر فرمایا: ((أنزل القرآن على

سبعة أحرف كلها شاف كاف))"قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، ہر حرف اپنی جگہ پر کافی اور اپنے اندر راہنمائی کا مکمل سامان رکھتا ہے۔'' اور ایک روایت میں الفاظ ہیں: ''ان میں سے ہر حرف اپنی جگہ پر صحیح ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ ((فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ)) یعنی ''اللہ کی طرف سے نازل کردہ ان حروف میں سے جو تمہیں آسان معلوم ہو، وہ پڑھ لو۔'' اس میں قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کرنے کی حکمت ومصلحت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد امت کے لیے آسانی اور قراءت قرآن میں سہولت فراہم کرنا ہے، تاکہ ہر انسان اپنی سہولت کے مطابق وہ قراءت کر سکے جو اس کی زبان پر سہل اور رواں ہو، اور پڑھتے ہوئے وہ کسی قسم کی دقت محسوس نہ کرے۔ تو گویا اس حدیث میں قراءت کی کیفیت کو بیان کرنا مقصد ہے، لیکن اللہ کے فرمان: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ میں کیفیت کی بجائے قراءت کی مقدار بیان کرنا پیش نظر ہے۔

حدیث نمبر 3

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ بنوغفار کے تالاب کے پاس موجود تھے کہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو ایک حرف پر قرآن پڑھائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ سے معافی اور بخشش کا طلب گار ہوں، میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ جبریل علیہ السلام دوسری بار تشریف لائے تو کہا: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو دو حروف پر قرآن پڑھائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں کہ میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ جبریل علیہ السلام تیسری بار آئے تو کہا: اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو تین حروف پر قرآن پڑھائیں۔ فرمایا: میں اللہ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں، میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ جبریل علیہ السلام چوتھی بار آئے تو کہا:

((إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَقْرَأَ أُمَّتُكَ الْقُرْآنَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، فَأَيُّمَا

حَرْفٍ قَرَءُوا عَلَيْهِ فَقَدْ أَصَابُوا .)) ❶

''اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو سات حروف پر قرآن پڑھائیں۔ جس حرف کے مطابق بھی وہ قراءت کریں گے، درست ہوگا۔''

حدیث کے بعض الفاظ کی تشریح:

(الأضاة) ہمزہ کی فتح اور ضاد معجمہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے: ''پانی کا تالاب''، اس کی جمع ''أضًا'' ہے، جیسے ''حصاة'' کی جمع ''حصًا'' ہے اور اگر یہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ''إضاة'' ہو تو یہ مدینہ منورہ میں ایک جگہ کا نام ہے اور بنو غفار کی طرف اس کی نسبت کی وجہ یہ ہے کہ یہ قبیلہ اسی جگہ مقیم تھا۔

اور جبریل علیہ السلام کا آپ ﷺ سے یہ کہنا: ((فَأَيُّمَا حَرْفٍ قَرَءُوا عَلَيْهِ فَقَدْ أَصَابُوا .)) امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''آپ ﷺ کی امت کو سات حروف تک اختیار ہے، ان سات سے تجاوز جائز نہیں ہے۔ اور امت ان سات میں سے جس حرف کو چاہے آگے نقل کر سکتی ہے۔''

حدیث نمبر 4

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں تھا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا اور نماز پڑھنے لگا۔ اس نے جو قراءت پڑھی، وہ میں نہیں جانتا تھا۔ پھر دوسرا آدمی مسجد میں داخل ہوا، اس نے جو قراءت پڑھی، وہ پہلے شخص کی قراءت سے مختلف تھی۔ جب ہم نماز پڑھ چکے تو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی: اللہ کے رسول ﷺ، اس شخص نے جس قراءت میں قرآن پڑھا ہے، وہ میرے لیے بالکل نئی ہے اور یہ دوسرا شخص، اس کی قراءت اپنے ساتھی کی قراءت سے مختلف ہے۔ نبی ﷺ نے ان سے کہا: اب پڑھو۔ انہوں نے پڑھا تو آپ ﷺ نے ان کی قراءت کی تعریف کی۔ یہ سن کر میرے دل میں تکذیب کی ایسی کیفیت پیدا ہوئی جو شاید دور جاہلیت میں بھی نہیں تھی۔

❶ صحیح مسلم، رقم: 821۔ سنن ابی داؤد، رقم 1478۔ سنن النسائی: 939.

جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس کیفیت میں مبتلا دیکھا تو میرے سینے پر ہاتھ مارا۔ میں پسینے میں شرابور ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ ایک حرف پر قرآن پڑھو۔ تو میں نے درخواست کی کہ میری امت پر آسانی کی جائے۔ تو دوبارہ حکم ملا کہ امت کو دو حروف پر قرآن پڑھاؤ۔ میں نے عرض کی کہ میری امت پر مزید آسانی کی جائے۔ تو تیسری مرتبہ یہ حکم ملا کہ امت کو سات حروف پر قرآن پڑھاؤ۔ اور ہر حکم اور جواب کے بدلے میں آپ ﷺ کو تین چیزیں مانگنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے عرض کی: اللہ میری امت کو معاف کر دے، اللہ میری امت کو معاف کر دے۔ اور تیسری دعا میں نے اس دن کیلیے مؤخر کر دی، جس دن پوری انسانیت مجھ سے رجوع کرے گی، یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام بھی۔ ❶

اس حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ ہیں کہ تیسری دعا کو میں نے روز قیامت اپنی امت کی سفارش کے لیے ذخیرہ کر لیا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں کو اس طرح کس نے پڑھایا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح پڑھایا ہے۔ تو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے بھی رسول اللہ ﷺ نے ہی پڑھایا ہے؟ میں تمہیں ضرور رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ تینوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب ان دونوں نے اپنی اپنی قراءت آپ ﷺ کے سامنے پیش کی تو آپ ﷺ نے ان کی قراءت کی تعریف کی اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں سے فرمایا: بہت خوب۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ہر ایک سے یہی کہا کہ تم نے درست پڑھا ہے۔ آپ ﷺ نے ہر ایک کی قراءت کو باہم مختلف ہونے کے باوجود درست قرار دیا۔

❶ صحیح مسلم برقم: 820 ۔ مسند احمد، رقم: 21179

حدیث کے بعض الفاظ کی تشریح:

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ ((فَسُقِطَ فِیْ نَفْسِیْ مِنَ التَّکْذِیْبِ وَلَا إِذْ کُنْتُ فِی الْجَاهِلِیَّةِ)) تو اس کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ "میرے دل میں تکذیب کی ایسی خلش پیدا ہوئی جو کبھی حتی کہ دورِ جاہلیت میں بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔" اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "میرے دل میں شک اور انکار کا ایسا کانٹا چبھا، جس کی تلخی دورِ جاہلیت سے زیادہ شدید تھی۔"

اور امام نووی رحمہ اللہ نے اس جملہ کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شیطان نے میرے دل میں انکارِ نبوت کا ایسا کانٹا چبھو دیا جو دورِ جاہلیت سے زیادہ سخت تھا۔ وہ دل جو دورِ جاہلیت میں غفلت اور شکوک وشبہات کی وادیوں میں بھٹکتا رہا تھا، اب پھر شیطان نے ایک لمحہ کیلئے اسے انکار وتکذیب پر آمادہ کر لیا تھا۔

اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو شیطان نے ایسا ورغلایا کہ ان کے دل کی حالت مکدر ہو گئی اور ایمان متزلزل ہونے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ان کے سینے پر ہاتھ مارا، جس سے شکوک شبہات کا اندھیرا چھٹ گیا، باطن روشن ہوا اور دل ایمان ویقین کی اسی تابناک حالت پر واپس آ گیا۔ پھر اس ہنگامی حالت کا خیال آتے ہی وہ خوفِ الٰہی سے کانپ اٹھے اور اللہ سے شرم وحیا کے مارے پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ان کے دل میں آنے والا یہ شیطانی خیال بالکل اسی قبیل سے ہے، جیسے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسے خیالات محسوس کرتے ہیں کہ ان کا زبان پر لانا بھی ہمارے لیے بڑا گراں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا واقعی تم یہ کیفیت محسوس کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں واقعی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ صریح ایمان کی نشانی ہے۔"[1]

قاضی عیاض رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ

---

[1] صحیح مسلم رقم: 209۔ سنن ابی داؤد رقم: 5111.

اس لیے مارا تھا تاکہ وہ اس مذموم شیطانی خیال کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں جو ان کے دل پر اثر انداز ہوا تھا۔ اور لفظ ((فـرقـا)) فاء اور راء کی فتح کے ساتھ، خوف، رعب اور گھبراہٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کامل اور یقین محکم سے نوازا تھا۔ اختلاف قراءت کے سبب شیطان کے بہکاوے میں آ گئے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ہاتھ جب سینہ پر پڑا تو اس کی برکت سے وہ شیطانی خیال ریزہ ریزہ ہو گیا اور پسینے کے ساتھ بہہ گیا اور شیطان سے مغلوبیت کی شرمندگی کے زیر اثر نگاہیں اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھ گئیں۔''

بعض روایات میں ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اپنے دل میں شیطانی خیالات کو محسوس کیا، جس سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ اَخْسِئْهُ عَنْهُ الشَّيْطَانَ)) کہ ''اے اللہ، ان سے شیطان کو دور کر دے۔'' اور دوسری روایت میں ہے: ((اَللّٰهُمَّ أَذْهِبْ عَنْ أُبَيٍّ الشَّكَّ)) کہ ''اے اللہ! ابی کا شک دور کر دے۔''

بہرحال ہمارا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے دل میں شیطانی خیال پیدا ضرور ہوا تھا، لیکن وہ زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا، بلکہ فوراً ہی رخصت ہو گیا تھا، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اتنا مضبوط تھا کہ اس کے نور کے سامنے شکوک وشبہات اور حیرت واستعجاب کے اندھیرے اپنا وجود کھو دیتے تھے۔ اور یہ حقیقت تو دین کے مسلمات میں سے ہے کہ محض شیطانی خیال اور وسوسہ پر انسان کا محاسبہ نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ ان خواہشات نفسانی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنی کشتی ان کے بہاؤ پر نہ چھوڑ دے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل شروع نہ کر دے۔ لیکن اگر وہ ان خیالات کو دل سے جھٹک دینے کی کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس کا مواخذہ نہیں کرے گا۔ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ شیطانی وسوسہ سے دوچار ہوئے تھے اور نوع انسانی میں سے کوئی بھی انسان، خواہ

اس کا ایمان کتنا ہی راسخ اور یقین کتنا ہی محکم کیوں نہ ہو، کسی بھی وقت اس حادثہ سے دوچار ہو سکتا ہے۔اور ایسا ہونا بشری تقاضا اور انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آیا، کیونکہ وہ اس وقت نہیں جانتے تھے کہ قرآن کریم مختلف قراءات کے مطابق نازل ہوا ہے،لیکن جب پتہ چلا تو فوراً ہی یہ وسوسہ ان کے دل سے رفع ہو گیا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا شمار جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے، جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مکمل قرآن حفظ تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن کمیٹی کے باقاعدہ ممبر تھے۔

اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ((وَ كَأَنَّمَا أَنْظُرُ إِلَى اللّٰهِ)) یعنی "مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔" معلوم ہوا کہ وہ خیال کی گویا ایک رو تھی جو بجلی کی طرح ان کے دل سے گزر گئی تھی۔اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وضاحت آ گئی تو پورے یقین اور اعتماد سے حق کو پہچان لیا۔اور کون نہیں جانتا کہ ہم میں سے ہر انسان کو خیالات کی ایسی دنیا سے واسطہ پڑتا ہے، جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اور کوئی بھی انسان اس قسم کے خیالات سے اپنے دل کو بچا نہیں سکتا۔ ہر مومن کے دل کو ایسے شیطانی خیالات سے واسطہ پڑتا ہے،لیکن جب اللہ کا لشکر نمودار ہوتا ہے تو ان مذموم خیالات کے پس پردہ شیطان کا لشکر بھاگ کر کسی اور دل میں نقب زنی شروع کر دیتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: ((فَرَدَدْتُ عَلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلَى أُمَّتِي)) اس میں "أن" تفسیر یہ ہے، کیونکہ "رَدَدْتُ" یہاں قول کے معنی میں ہے۔یعنی "میں نے جواب میں یہ کہا کہ میری امت پر آسانی کی جائے۔" اور یہی مفہوم دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ((أَسْأَلُ اللّٰهَ مُعَافَاتَهُ وَ مَغْفِرَتَهُ)) کا ہے۔

آپ کا فرمان: ((فَرَدَّ إِلَيَّ الثَّالِثَةَ اِقْرَأْهُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) یعنی "تیسری مرتبہ یہ حکم ملا کہ امت کو سات حروف پر قرآن پڑھاؤ۔" روایت کے ان الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تیسری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سات حروف پر قرآن کریم پڑھنے کا حکم ملا تھا،

لیکن حدیث نمبر 3 سے معلوم ہوتا ہے کہ سات حروف پر قرآن پڑھنے کا حکم چوتھی مرتبہ ملا تھا۔ دونوں احادیث کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ یہ حکم جبریل علیہ السلام کی چوتھی دفعہ آمد کے موقع پر ہی ملا تھا، لیکن اس حدیث نمبر 4 میں جبریل علیہ السلام کی آمد کے ایک موقع کو (اختصار کے پیش نظر) حذف کر دیا گیا ہے۔

اور اللہ کی طرف سے یہ حکم: ((وَلَكَ بِكُلِّ رِدَّةٍ رَدَدْتُكَهَا مَسْأَلَةٌ تَسْأَلُنِيهَا)) یعنی "میرے ہر حکم اور جواب کے بدلے میں آپ کو تین چیزیں مانگنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔" امام نووی رحمہ اللہ ان الفاظ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی یہ تین دعائیں یقیناً شرف قبولیت سے ہمکنار ہوں گی۔ باقی دعائیں بھی آپ ﷺ کی قبول ہوتی تھیں، لیکن بعض کی قبولیت یقینی نہیں تھی۔

تنبیہ: ...... وہ قراءت جس سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے دو ساتھیوں کے سامنے لاعلمی کا اظہار کیا تھا، وہ سورۃ النحل کی کوئی آیت تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سی آیت تھی۔

حدیث نمبر 5:

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جبریل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو فرمایا: اے جبریل! میں ان پڑھ لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں، جن میں نہایت بوڑھے مرد و عورتیں بھی ہیں، بچے بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی جنہوں نے کبھی کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا: اے محمد ﷺ! (فکر نہ کریں) قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ❶

حدیث کے بعض الفاظ کی تشریح:

"أُمِّيِّينَ" ، یہ أُمِّيٌّ کی جمع ہے، اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو نہ لکھ سکتے ہوں اور نہ

---

❶ مسند احمد، رقم: 23398، سنن ترمذی، رقم: 2944، امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو "حسن صحیح" قرار دیا ہے۔

پڑھ سکتے ہوں۔ قرآن میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (الجمعة: 2)

''وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہیں میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ((إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ))

یعنی ''جس قوم کی طرف مجھے مبعوث کیا گیا ہے، اس وقت ان کی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی اصل حالت پر ہیں، جس پر ان کی ماؤں نے انہیں جنم دیا تھا، لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے۔'' اس پر مستزاد یہ کہ ان میں بے شمار بوڑھے مرد وخواتین اور بچے بچیاں بھی ہیں۔ اگر ایک ہی طریقہ پر انہیں قرآن پڑھنے کا مکلف ٹھہرایا گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی اور خدشہ ہے کہ یہ چیز کہیں ان کی قرآن سے دوری، انحراف اور اس کی تلاوت سے نفرت کا باعث نہ بن جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر خاص شفقت ورحمت فرماتے ہوئے حکم دیا کہ ان سات حروف میں سے جو آسان معلوم ہو، اس کے مطابق پڑھ لیا جائے۔ چنانچہ اس حدیث کے بعض طرق میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں: ((فَمُرْهُمْ، فَلْيَقْرَءُوا الْقُرْآنَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) یعنی ''(اے نبی ﷺ) اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کریم کو سات حروف کے مطابق پڑھ لیا کریں۔'' [1]

حدیث نمبر 6

ابو قیس مولیٰ عمرو بن العاص کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے قرآن کی ایک آیت پڑھی۔

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل، رقم: 21204، (صحيح) تحقيق: شعيب الأرنؤوط – عادل مرشد، وآخرون.

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا: یہ آیت یوں نہیں، بلکہ یوں ہے۔ وہ آدمی کہنے لگا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت اسی طرح پڑھائی ہے۔ وہ دونوں وہاں سے نکلے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور آپ ﷺ کے سامنے حقیقتِ حال عرض کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ نَزَلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، فَأَيُّ ذَلِكَ قَرَأْتُمْ أَصَبْتُمْ، فَلَا تَمَارَوْا فِي الْقُرْآنِ، فَإِنَّ الْمِرَاءَ فِيهِ كُفْرٌ.)) ❶

''بلاشبہ یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے، ان میں سے جو بھی تم پڑھو گے، درست ہوگا، قرآن کریم میں جھگڑا مت کرو، اس میں جھگڑنا بلاشبہ کفر ہے۔''

ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں تفسیرِ قرآن میں اختلاف سے نہیں، بلکہ الفاظِ قرآن میں اختلاف سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص قرآن کو ایک حرف کے مطابق پڑھتا ہے، اور دوسرا شخص کہے: یہ یوں نہیں، بلکہ یوں ہے، حالانکہ دونوں وجوہ منزل من اللہ ہیں۔ تو اس صورت میں اگر ایک شخص دوسرے کی قراءت کا انکار کرے گا، تو یہ کفر ہوگا، کیونکہ اس نے ایک ایسے حرف کا انکار کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ پر نازل کیا ہے۔ اور ایک روایت میں: ((فَإِنَّ مِرَاءً فِيهِ كُفْرٌ)) کے الفاظ ہیں۔ اس میں لفظ ''مِرَاءً'' نکرہ استعمال ہوا ہے اور نکرہ یہاں تقلیل کے معنی میں ہے، جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے بارے میں کم ترین جھگڑا بھی کفر کا موجب ہے۔''

حدیث نمبر 7

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ یہ فرمایا:

---

❶ مسند الإمام أحمد بن حنبل، رقم: 17819 (إسناده صحيح)، فضائل القرآن 1/337 للقاسم بن سلام.

((نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ ، الْمِرَاءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ ، فَمَا عَرَفْتُمْ مِنْهُ فَاعْمَلُوْا ، وَمَا جَهِلْتُمْ مِنْهُ فَرُدُّوْهُ إِلَى عَالِمِهِ .)) ❶

"قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، قرآن میں جھگڑنا باعث کفر ہے۔ لہٰذا جو تم جانتے ہو، اس پر عمل کرلو اور جو نہیں جانتے، اسے اپنے عالم کے سامنے پیش کر کے پوچھ لو۔"

حدیث نمبر 8

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آل حم میں سے ایک سورت پڑھائی۔ جب میں مسجد میں گیا تو میں نے ایک آدمی سے وہی سورت پڑھنے کی درخواست کی، لیکن وہ اس میں ایسے حروف پڑھ رہا تھا جو میں نے نہیں پڑھے تھے۔ (میں نے اعتراض کیا) تو اس نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی پڑھایا ہے۔ ہم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم سے پہلی قومیں اختلاف کے باعث ہی ہلاک ہوئی تھیں۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کان میں کچھ کہا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں یہ حکم دے رہے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص اسی طرح پڑھے، جس طرح اسے سکھایا گیا ہے۔ کہتے ہیں: یہ سن کر ہم وہاں سے چل دیے اور ہم میں سے ہر شخص کچھ ایسے حروف پڑھتا تھا جو اس کا ساتھی نہیں پڑھتا تھا۔ ❷

---

❶ مسند احمد، رقم: 7989، إسناده صحيح على شرط الشيخين و أخرجه النسائي في الكبرى، رقم: 8093، وأبو يعلى، رقم: 6016، والطبري 11/1، وابن حبان، رقم: 74.

❷ المستدرك على الصحيحين، رقم: 2885، أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله (المتوفى: 405هـ) تحقيق: مصطفى عبد القادر عطا، دار الكتب العلمية بيروت، الطبعة الأولى، 1411-1990ء، صحيح ابن حبان، رقم 747، محمد بن حبان بن أحمد بن حبان بن معاذ بن مَعْبد التميمي أبو حاتم الدارمي البُستي (المتوفى: 354هـ)، المحقق: شعيب الأرنؤوط، مؤسسة الرسالة - بيروت، الطبعة الثانية: 1414-1993ء قال الألباني وشعيب الأرنؤوط: "حسن".

حدیث نمبر 9

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مجھے ایک سورت پڑھائی ہے اور زید رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بھی پڑھائی ہے لیکن تینوں کی قراءت ایک دوسرے سے مختلف ہے، میں کس کی قراءت اختیار کروں؟ آپ خاموش رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پہلو میں موجود تھے، تو انہوں نے فرمایا: ''تم میں سے ہر شخص اسی طرح پڑھے، جس طرح اسے سکھایا گیا ہے، وہی حسین و جمیل ہیں۔ ❶

حدیث نمبر 10

حافظ ابو یعلی الموصلی نے اپنی مسند الکبیر میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ایک دن ممبر پر کھڑے ہو کر مجمع عام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث: ((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ كُلُّهَا شَافٍ كَافٍ)) سنی ہے، میں اسے اللہ کا واسطہ دے کر حکم دیتا ہوں کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ یہ سن کر اتنے لوگ کھڑے ہو گئے کہ انہیں شمار کرنا ممکن نہیں تھا۔ سب نے گواہی دی کہ قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ہر حرف اپنی جگہ پر کافی اور اپنے اندر راہنمائی کا مکمل سامان رکھتا ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بھی ان لوگوں کے ساتھ یہی گواہی دیتا ہوں۔ ❷

راوی کا یہ بیان کہ ''اتنے لوگ کھڑے ہو گئے کہ انہیں شمار کرنا ممکن نہیں تھا'' اس حدیث کے متواتر ہونے کی واضح دلیل ہے۔ نیز تمام حفاظ حدیث اس حدیث کے متواتر ہونے پر متفق ہیں، جن میں امام ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ سر فہرست ہیں۔

---

❶ اسے امام ابن جریر طبری اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔

❷ المقصد العلي في زوائد أبي يعلى الموصلي: 3/120، رقم: 1216، أبو الحسن نور الدين علي بن أبي بكر بن سليمان الهيثمي (المتوفى: 807هـ)، تحقيق: سيد كسروي حسن، دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان.

امام سیوطی رحمہ اللہ نے "اتقان فی علوم القرآن" میں لکھا ہے کہ حدیث: ((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) کو 21 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے، جن کے نام یہ ہیں: ابی بن کعب، انس بن مالک، حذیفہ بن یمان، زید بن ارقم، سمرۃ بن جندب، سلیمان بن سرد، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمٰن بن عوف، عثمان بن عفان، عمر بن خطاب، عمرو بن ابی سلمہ، عمرو بن العاص، معاذ بن جبل، ہشام بن حکیم، ابوبکرۃ، ابوجہم، ابوسعید خدری، ابوطلحہ انصاری، ابوہریرہ، ام ایوب رضی اللہ عنہم۔

مذکورہ بالا احادیث سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قراءات قرآنیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ انہیں رسول اللہ ﷺ پر بذریعہ وحی نازل کیا گیا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان: ((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) اور رسول اللہ ﷺ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ہشام رضی اللہ عنہ دونوں کی قراءت سن کر یہ فرمانا: ((هٰكَذَا أُنْزِلَتْ ، هٰكَذَا أُنْزِلَتْ)) اور آپ ﷺ کا فرمان: ((إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَقْرَأَ أُمَّتُكَ الْقُرْآنَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ ، فَأَيُّمَا حَرْفٍ قَرَءُوا عَلَيْهِ فَقَدْ أَصَابُوا .)) یعنی "اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو سات حروف پر قرآن پڑھائیں، جس حرف کے مطابق بھی وہ قراءت کریں گے، درست ہوگا۔" اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔

نیز ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قراءات قرآنیہ کو امین الوحی جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر پر نازل کیا تھا۔ اور ان احادیث سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ قراءات کا تمام تر انحصار رسول اللہ ﷺ سے بالمشافہ تلقی اور سماع پر ہے اور اس کی واضح دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہشام رضی اللہ عنہ کو قرآن پڑھتے سن کر یہ کہنا ہے کہ "وہ ایسے حروف پر قرآن پڑھ رہے تھے جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔" اور ہشام رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا کہ "مجھے رسول اللہ ﷺ نے یوں ہی پڑھایا ہے۔" اور اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہشام رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا کہ "مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ سورت دوسری طرح پڑھائی تھی، نہ کہ جیسا تم پڑھ رہے ہو۔" اسی طرح

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ سے یہ عرض کرنا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے ہشام رضی اللہ عنہ کو سورۃ الفرقان ایسے حروف پر پڑھتے سنا ہے، جو آپ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے۔'' نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ ''میں نے آپ ﷺ کو وہی قراءت پڑھ کر سنائی جو آپ ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی۔'' نیز یہاں حدیث میں لفظ "[اقراء" (رسول اللہ ﷺ کی طرف پڑھانے کی نسبت) کا بار بار تذکرہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ تمام تر قراءات کا دارومدار رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سماع پر ہے۔ اسی طرح حدیث نمبر 3، 6، 8، 9 میں لفظ "[اقـراء" کا تکرار اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قراءات قرآنیہ توقیفی ❶ ہیں اور ان کی بنیاد براہ راست تلقین وتلقی اور نقل وسماع پر ہے۔ اور قراءت میں اختلاف کا معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے والے دو آدمیوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ ''رسول اللہ ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص اسی طرح قرآن پڑھے، جس طرح اسے سکھایا گیا ہے۔'' کیا اس سے واضح نہیں ہوتا کہ قراءت کی صحت کا دارومدار سر اسر سماع اور بالمشافہہ روایت پر ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قراءات کے بارے میں تنازع اور ان کا رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرنا، جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہوا ہے، اس حقیقت کی واضح ترین دلیل ہے کہ قراءات قرآنیہ میں رائے اور خیال کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ کسی انسان کو اپنی طرف سے چمنستانِ قراءات میں کھلواڑ کی قطعاً کوئی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی مرضی اور قیاس سے ایک عبارت کو دوسری عبارت اور کسی لفظ کو اس کے مترادف دوسرے لفظ سے بدل دے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم الفاظ قرآن کے ضبط کے سلسلے میں انتہائی حساس واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے قرآن کے ایک ایک کلمہ اور حرف کی تحقیق کا ایسا کڑا، شاندار اور انتہائی بلند معیار قائم کر رکھا تھا کہ ادنیٰ سی تصحیف وتبدیلی بھی دامنِ قرآن میں راہ نہ پاسکتی تھی۔ حضرت عمر

---

❶ یعنی قراءات قرآنیہ میں کسی انسان کی رائے اور اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ ہر قراءۃ بسند متواتر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کے ساتھ سلوک، ان کی گردن میں چادر ڈال کر انہیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کرنا، اس حقیقت پر بین دلیل ہے کہ قراءات قرآنیہ کا منبع و ماخذ وحی الٰہی ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب ہشام کو ایسی قراءت پڑھتے ہوئے سنا جو انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنی تھی تو ان کا ماتھا ٹھنکا، کیونکہ اس وقت شاید انہیں معلوم نہیں تھا کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے، لہٰذا انہوں نے سمجھا کہ ہشام نے اپنی طرف سے قراءت میں تبدیلی کی ہے، لیکن جب انہیں زبان رسالت سے پتہ چل گیا کہ اس قراءت کا ماخذ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے اور قرآن کریم اللہ کی خاص رحمت اور امت کی آسانی کے لیے متعدد وجوہ پر نازل ہوا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے امت کو سکھائی ہیں تو آپ فوراً مطمئن ہو گئے اور اس کے بعد انہوں نے ہشام یا کسی اور صحابی سے اس سلسلہ میں کبھی تعرض نہیں کیا۔ اور اس وقت تعرض کی وجہ صرف یہی تھی کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں یہ کتاب اللہ میں تبدیلی نہ ہو اور ہم جانتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ حق کے معاملے کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور نہ کوئی خوف انہیں حق کے سلسلے میں مداہنت پر آمادہ کر سکتا تھا۔

دوسری دلیل:

تاریخ کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مصاحف عثمانیہ کی تدوین کے بعد انہیں مختلف علاقوں کی طرف روانہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا بلکہ خلیفہ راشد عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ہر مصحف کے ساتھ ایک ماہر قاری قرآن بھی بھیجا تھا، تاکہ وہ اس کے مطابق مسلمانوں کو قرآن کریم کی تعلیم دے۔ چنانچہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم ملا کہ وہ مدینہ منورہ میں قرآن پڑھائیں۔ عبد اللہ بن السائب کو مکہ مکرمہ روانہ کیا گیا۔ مغیرہ بن ہشام کو شام، عامر بن عبد قیس کو بصرہ اور ابو عبد الرحمن السلمی کو کوفہ میں تعلیم قرآن پر مامور کیا گیا۔ ان میں سے ہر قاری قرآن اپنے اہل علاقہ کو صرف وہی قراءات سکھانے کا پابند تھا جو رسول اللہ ﷺ سے بطریق تواتر ثابت تھی اور رسم عثمانی ان کا متحمل تھا۔ اخبار آحاد اور منسوخ قراءات اس تعلیم میں شامل نہیں تھیں،

باوجود اس کے کہ رسم عثمانی ان کا متحمل تھا۔ ہر مصحف کے ساتھ ماہر قاری قرآن کو بھیجنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ امت مسلمہ کو صرف انہیں قراءات کا پابند کر دیا جائے جو تواتر سے ثابت اور رسم عثمانی کے مطابق ہیں۔ اگر قراءات قرآنیہ کا سرچشمہ و ماخذ صرف رسم مصحف ہوتا اور ہر شخص کو اجازت ہوتی کہ وہ ہر ایسی قراءت پڑھ سکتا ہے، جو رسم عثمانی کے مطابق ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ تواتر سے ثابت ہے یا اخبار آحاد سے، عرضہ اخیرہ کے وقت اسے باقی رکھا گیا تھا یا منسوخ کر دیا گیا تھا، اس کی کوئی سند ہے یا نہیں ہے۔ ❶ تو پھر عثمانی حکومت کو ہر مصحف کے ساتھ ایک ماہر قاریء قرآن بھیجنے کی قطعا کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہر مصحف کے ساتھ قراءات کے ایک ماہر عالم کو تعلیم کے لیے متعین کرنا، اس حقیقت کا ٹھوس ثبوت ہے کہ قراءات کا تمام تر انحصار سماع اور نقل تواتر پر تھا اور رسم الخط اور کتابت پر قطعا نہ تھا۔

تیسری دلیل:

قابل غور بات یہ ہے کہ اگر اختلاف قراءات کا سبب مصاحف کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا تھا، یعنی اگر قراءات قرآنیہ رسم مصحف کے نقطوں اور حرکات سے خالی ہونے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہوتیں تو پھر ہر وہ قراءت صحیح اور قرآن متصور ہونی چاہیے تھی جو رسم عثمانی کے مطابق تھی، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ رسم مصاحف جن قراءات کا متحمل ہو سکتا ہے، ہم انہیں چار اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلی قسم: ان قراءات کی ہے جو بذریعہ تواتر ثابت ہیں۔ مثلا فرمان الٰہی: ﴿وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا﴾ (الإسراء: 13) یہاں لفظ "نُخْرِجُ" میں تین قراءات ہیں۔ پہلی قراءۃ نون کی پیش اور راء کی زیر کے ساتھ "نُخْرِجُ" ہے۔ دوسری قراءۃ یاء کی پیش اور راء کی فتح کے ساتھ "يُخْرَجُ" ہے اور تیسری قراءۃ یاء کی فتح اور راء کی پیش کے ساتھ (يَخْرُجُ) ہے۔ یہ تینوں قراءات تواتر سے ثابت ہیں اور یہ سب رسم مصحف میں سما سکتی ہیں۔

---

❶ جیسا کہ گولڈ زیہر کا نقطہ نظر ہے کہ قراءات میں اختلاف کا سبب رسم عثمانی کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا ہے۔

دوسری قسم: ان قراءات کی ہے جو بذریعہ خبر واحد مروی ہیں اور ان کی سند صحیح ہے۔ ہر طبقہ میں، یعنی شروع سے لے کر آخر سند تک اسے ثقہ اور ضابط راویوں نے روایت کیا ہے۔ نیز فن قراءت کے ماہرین کے ہاں یہ قراءات انتہائی مشہور اور علمائے قراءت کے ہاں انہیں تسلیم وقبولیت کا شرف حاصل ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا﴾ (الأعراف 58) یہاں لفظ "يَخْرُجُ" میں ایک قراءۃ، یاء کی پیش اور راء کی زیر کے ساتھ "يُخْرِجُ" بھی ہے۔ اور فرمان الٰہی: ﴿أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (التوبۃ: 19) یہاں لفظ "سِقَايَةَ" میں ایک قراءۃ سین کی پیش اور حذف یاء کے ساتھ "سُقَاةَ" بھی ہے اور یہ "ساق" کی جمع ہے، جیسا کہ "رماۃ" "رام" کی جمع ہے اور لفظ "عِمَارَةَ" میں ایک قراءۃ عین اور میم کی زبر، اس کے بعد حذف الف کے ساتھ "عَمَرَةَ" بھی ہے۔ یہ "عامر" کی جمع ہے، جیسا کہ "صنعۃ" "صانع" کی جمع ہے۔ یہ دونوں قراءات اگرچہ خبر واحد سے ثابت ہیں، لیکن نہ صرف ان کی سند صحیح ہے، بلکہ قراء کے ہاں یہ مشہور ومعروف اور انہیں تلقی بالقبول بھی حاصل ہے اور رسم مصحف بھی ان کا متحمل ہے۔

مذکورہ دونوں اقسام قراءات بالاتفاق قرآن ہیں۔ نماز یا اس کے علاوہ ان کی تلاوت عبادت ہے۔ ان کو قرآن تسلیم کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ان کا انکار قطعاً گناہ ہے۔ جو شخص ان کا انکار کرتا ہے وہ بلاشبہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

تیسری قسم: ...... ان قراءات کی ہے جو بذریعہ خبر واحد ثابت ہیں اور ان کی سند صحیح ہے، لیکن وہ فن قراءت کے ماہرین کے ہاں نہ تو زیادہ مشہور ہیں اور نہ ہی انہیں علمائے قراءت کے ہاں قبول عام حاصل ہے، مثلاً فرمان الٰہی: ﴿وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا﴾ (الأحزاب: 69) میں ایک قراءۃ عین کی فتح، باء ساکن اور دال کی تنوین (دو زبر) کے ساتھ "وَكَانَ عَبْدًا لِلَّهِ وَجِيهًا" اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ قراءۃ کی یہ قسم شاذ ہے۔ نماز یا اس کے علاوہ اس کی تلاوت حرام ہے اور اس کی تلاوت کو عبادت قرار دینا قطعاً جائز

نہیں ہے۔

چوتھی قسم: ...... وہ قراءات جن کی سند صحیح نہیں یا سرے سے ان کی کوئی سند ہی نہیں ہے۔ مثلاً: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا إِيَّاهُ﴾ میں بعض قراء نے لفظ "إِيَّاهُ" کو ہمزہ کے کسرہ (زیر) اور یائے مشدد وہ کے بجائے ہمزہ کی فتح (زبر) اور باء کے ساتھ "أَبَاهُ" پڑھا ہے۔ یہ قسم قطعاً قرآن نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کی تلاوت کو کسی حال میں عبادت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے اجماع کی رو سے اس کی تلاوت حرام ہے۔ مؤخر الذکر دونوں اقسام بالاتفاق قرآن نہیں ہیں، حالانکہ مصحف کے رسم میں ان کی گنجائش موجود ہے۔ یہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ قراءات قرآنیہ کے وجود میں رسم کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

اس دلیل کی مزید وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ایسے کلمات موجود ہیں، جن کا رسم ہر جگہ ایک جیسا ہے، لیکن ان میں سے بعض مقامات پر رسم کے مطابق ایک سے زائد قراءات ہیں جو متواتر ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر تمام قراء ایک ہی قراءۃ پر متفق ہیں اور ایک کے سوا کوئی بھی قراءۃ صحیح ثابت نہیں ہے، باوجودیکہ رسم دیگر قراءات کا بھی متحمل ہے۔ اس کی چند مثالیں یہاں پیش کی جا رہی ہیں:

پہلی مثال: لفظ "مــالك" ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں تین مقامات پر صفت یا صفت کے حکم میں استعمال ہوا ہے: پہلی دفعہ سورۃ فاتحہ کی آیت ۳: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ میں، دوسری بار سورۃ آل عمران کی آیت ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ میں اور تیسری بار سورۃ الناس کی آیت ۲: ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ میں استعمال ہوا ہے۔

ان تینوں جگہ پر اس کلمہ کا رسم میم کے بعد حذف الف کے ساتھ ایک ہی ہے، لیکن قراء کا اختلاف صرف ایک جگہ سورۃ فاتحہ میں ہے۔ بعض قراء نے اسے حذف الف کے ساتھ "مَلِكِ" پڑھا ہے اور بعض نے اثبات الف کے ساتھ "مٰلِكِ" پڑھا ہے۔ لیکن سورۃ آل عمران اور سورۃ الناس میں تمام قراء اثبات الف کے ساتھ ایک ہی قراءۃ پر متفق ہیں، حالانکہ

اگر یہاں حذف الف کے ساتھ بھی پڑھا جاتا تو لغوی اور معنوی اعتبار سے کوئی حرج نہیں تھا لیکن یہاں حذف الف کی ایک بھی روایت ثابت نہیں ہے۔

سوچنے کا مقام یہ ہے کہ اگر قراءات قرآنیہ وحی الٰہی کی بجائے محض رائے واجتہاد کا کرشمہ اور رسم مصحف کا نتیجہ ہوتیں تو پھر لفظ "مـلـك" میں قراءات کا اختلاف صرف سورۃ فاتحہ کی حد تک محدود نہ ہوتا، بلکہ سورۃ آل عمران اور الناس جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں بھی ضرور قراءات کا یہی اختلاف ہوتا، لیکن اس لفظ میں قراءات کا اختلاف صرف سورۃ الفاتحہ کے مقام پر ہے۔ سورۃ آل عمران اور سورۃ الناس میں تمام قراء ایک ہی قراءت پر متفق ہیں۔ ثابت ہوا کہ قراءات قرآنیہ میں کسی کی ذاتی پسند و ناپسند اور اجتہاد کو قطعاً کوئی عمل دخل نہ تھا اور نہ ہی رسم الخط کا ان کی تعیین میں کوئی کردار تھا، بلکہ ان قراءات قرآنیہ کا تمام تر دارومدار سند، روایت اور نقل پر تھا۔

اس سلسلے کی دوسری مثال: لفظ "غشاوۃ" ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک دفعہ سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَـٰوَةٌ﴾ میں اور دوسری بار سورۃ الجاثیہ کی آیت ﴿وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَـٰوَةً﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا رسم ان دونوں جگہ پر تمام مصاحف عثمانیہ میں شین کے بعد حذف الف کے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود سورۃ بقرۃ میں اس لفظ کو تمام قراء نے متفقہ طور پر غین کی زیر، شین کی زبر اور اس کے بعد اثبات الف کے ساتھ "غِشَـٰوَةٌ" پڑھا ہے، لیکن سورۃ الجاثیہ میں بعض قراء نے اس لفظ کو غین کی زیر، شین کی فتح اور اس کے بعد اثبات الف کے ساتھ "غِشَـٰوَةً" پڑھا ہے، اور بعض نے اسے غین کی زبر اور شین ساکن کے ساتھ "غَشْوَةً" پڑھا ہے۔ اگر سورۃ البقرۃ میں بھی اسے غین کی زبر اور شین ساکن کے ساتھ "غَشْوَةٌ" پڑھ لیا جاتا تو لغوی اور معنوی طور پر کوئی حرج نہیں تھا، لیکن یہاں کسی نے بھی اس انداز سے نہیں پڑھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر قراءات قرآنیہ رسم واجتہاد کا کرشمہ ہیں تو پھر سورۃ البقرۃ میں "غِشَـٰوَةٌ" کو "غَشْوَةٌ" پڑھنے میں اس کے سوا آخر کون سی رکاوٹ تھی کہ سنداً ایسا ثابت نہیں تھا۔ یہ دلیل اس حقیقت کا واضح

ثبوت ہے کہ قراءات کا اصل سرچشمہ براہِ راست سماع ہے اور رسم مصحف قطعاً قراءات کا ماخذ نہیں ہیں۔

اس سلسلے کی **تیسری مثال**: لفظ "الصاعقة" ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں کہیں معرفہ تو کہیں نکرہ چھ بار آیا ہے:

سب سے پہلے سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿فَأَخَذَتْكُمُ الصَّعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾ میں، اس کے بعد سورۃ النساء کی آیت ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ﴾ میں، تیسری اور چوتھی بار سورۃ فصلت کی آیت ﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَعِقَةً مِثْلَ صَعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾ میں، پانچویں بار سورۃ فصلت کی آیت ﴿فَأَخَذَتْهُمْ صَعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ میں اور چھٹی بار سورۃ الذاریات کی آیت ﴿فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا رسم ان چھ جگہ پر تمام مصاحف عثمانیہ میں صاد کے بعد بغیر الف کے ہے۔ اس کے باوجود پہلے پانچ مقامات پر اس لفظ کو تمام قراء نے متفقہ طور پر صاد کے بعد اثبات الف اور عین کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن چھٹے مقام پر قراء کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسے پہلے پانچ مقامات کی طرح صاد کے بعد اثبات الف اور عین کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور بعض نے صاد کے بعد حذف الف اور عین ساکن کے ساتھ "الصَّعْقَةُ" پڑھا ہے۔ البتہ دونوں قراءات کے مفہوم میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سوچئے! اگر قراءات کا اختلاف رسم کا مرہونِ منت ہوتا تو چھٹے مقام کی طرح پہلے پانچ مقامات پر بھی قراء کا اختلاف ہوتا، لیکن تمام قراء پہلے پانچ مقامات پر متفق ہیں، اختلاف صرف چھٹے مقام پر ہے۔ ثابت ہوا کہ قراءات میں اختلاف کی اصل بنیاد رسم اور کتابت نہیں بلکہ وحی اور روایت ہے۔

چوتھی مثال: "کرھا" ہے۔ یہ لفظ بھی قرآن میں چھ بار آیا ہے۔ پہلی بار سورۃ آل عمران، آیت: ﴿وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ﴾ میں، دوسری بار سورۃ النساء کی آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ

أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا﴾ میں، تیسری بار سورۃ التوبۃ کی آیت ﴿قُلْ أَنْفِقُوا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا لَنْ يُتَقَبَّلَ مِنْكُمْ﴾ میں، چوتھی بار ﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا﴾ میں، پانچویں بار سورۃ فصلت، آیت ﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا﴾ میں اور چھٹی بار سورۃ احقاف، آیت ﴿حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

یہاں پہلے، چوتھے اور پانچویں مقام پر تمام قراء نے اس لفظ کو بالاتفاق کاف کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے، البتہ دوسرے، تیسرے اور چھٹے مقام پر قراء کا اختلاف ہے۔ یہاں بعض نے اسے کاف کی پیش اور بعض نے کاف کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ لغات کا اختلاف ہے، لیکن دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ مصاحف اگر حرکات سے خالی ہوں تو چھ کے چھ مقامات پر پیش اور زبر کی دونوں قراءات کی گنجائش موجود ہے، لیکن پہلے، چوتھے اور پانچویں مقام پر کسی نے بھی اس لفظ کو پیش کے ساتھ نہیں پڑھا۔ تو اگر مصاحف کا حرکات سے خالی ہونا اختلاف قراءات کا باعث ہوتا تو پھر قراء کا اختلاف چھ کے چھ مقامات پر ہونا چاہیے تھا۔ رسم الخط ایک ہونے کے باوجود بعض مقامات پر قراء ایک ہی قراءت پر متفق ہیں اور بعض مقامات پر ان کے درمیان اختلاف چہ معنی دارد؟ یقیناً یہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ اختلاف قراءات کی بنیاد نقل و روایت ہے۔ مصاحف کے حرکات سے خالی ہونے کا اختلاف قراءات میں کوئی دخل نہیں ہے۔

<u>پانچویں مثال</u>: ملاحظہ کیجئے: یہ بات ثابت ہے کہ امام نافع رحمہ اللہ نے سورۃ یونس کی آیت ﴿فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ﴾ سورۃ الانعام کی آیت ﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ﴾ اور سورۃ المجادلۃ کی آیت ﴿لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ میں لفظ "يحزن" کو یاء کی پیش اور زاء کی زیر کے ساتھ "يُحْزِن" پڑھا ہے۔ لیکن سورۃ الانبیاء کی آیت ﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ﴾ میں اس لفظ کو یاء کی زبر اور زا کی پیش کے ساتھ "يَحْزُن" پڑھا ہے۔

اور یہ بھی ثابت ہے کہ اہلِ مدینہ کے امام ابوجعفر نے اس کے برعکس سورۃ الانبیاء میں تو لفظِ "یحزن" کو یاء کی پیش اور زاء کی زیر کے ساتھ "یُحزِن" پڑھا ہے، لیکن باقی تمام مقامات پر اسے یاء کی زبر اور زاکی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ نیز قراءت کے ان دونوں ائمہ نے قراءات کے سلسلہ میں نقل اور روایت کا التزام کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر قراءات کا باعث مصاحف کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا ہے تو پھر ان دو ائمہ کے درمیان اس لفظ کے بارے میں یہ فرق کیوں ہے؟ جبکہ سب جگہ اس لفظ کا رسم ایک ہے اور لغوی اعتبار سے بھی دونوں قراءات کی گنجائش ہے اور دونوں کا معنی بھی ایک ہے۔ لغت میں "حزنہ و أحزنہ" کا معنی ہے: "اس معاملہ نے اسے رنجیدہ، فکرمند اور غمزدہ کر دیا۔" اور سیاق کلام بھی اس معنی کو قبول کرنے سے ابا نہیں کرتا۔

اس سلسلہ کی چھٹی مثال: لفظ "مدخلا" ہے، جو قرآن میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے۔ ایک دفعہ سورۃ النساء کی آیت ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾ میں اور دوسری بار سورۃ الحج کی آیت ﴿لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ﴾ میں۔ بعض قراء نے دونوں جگہ اسے میم کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے دونوں جگہ زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن تیسری جگہ سورۃ الاسراء، آیت ﴿وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ میں سب قراء نے بالاتفاق اس لفظ کو میم کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے، حالانکہ عربی لغت کی رو سے سابقہ دونوں مقامات کی طرح یہاں بھی میم کی زبر کے ساتھ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن اس جگہ کسی قاری نے بھی اسے میم کی زبر کے ساتھ نہیں پڑھا۔ اگر قراءاتِ قرآنیہ کا سرچشمہ رسم مصحف ہوتا تو یقیناً پچھلے دونوں مقامات کی طرح اس جگہ بھی اس لفظ کو میم کی پیش اور زبر کی دونوں قراءات کے ساتھ پڑھا جاتا۔ یہاں چونکہ میم کی زبر کے ساتھ قراءت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، اس لیے تمام قراء نے بالاتفاق اسے میم کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثابت ہوا کہ قراءات کا منبع و ماخذ وحی الٰہی اور نقل تواتر ہے، رسم اور کتابت قطعاً نہیں ہے۔

اس سلسلہ کی ساتویں مثال: لفظ "تخرجون" ہے:

سورۃ الاعراف کی آیت ﴿قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ﴾، سورۃ الروم کی آیت ﴿وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ﴾، سورۃ الزخرف کی آیت ﴿فَأَنشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ﴾ اور سورۃ الجاثیہ کی آیت ﴿فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ﴾ میں لفظ "تخرجون+یخرجون" کی قراءت کے متعلق قراء کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسے فعل مجہول کی بناء پر پہلے حرف (تاء) کی پیش اور تیسرے حرف (راء) کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے فعل معروف کی بناء پر پہلے حرف کی زبر اور حرف (راء) کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن سورۃ الروم کی آیت ﴿ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنتُمْ تَخْرُجُونَ﴾ میں تمام قراء نے بالاتفاق اسے فعل معروف کی بناء پر تاء کی زبر اور راء کی پیش کے ساتھ "تَخْرُجُونَ" پڑھا ہے۔ حالانکہ یہاں بھی مصاحف کے حرکات سے خالی ہونے کی وجہ سے سابقہ مقامات کی طرح دونوں قراءات کی گنجائش موجود تھی۔ یہاں فعل مجہول کی قراءت میں عربی لغت رکاوٹ تھی اور نہ آیت کا مفہوم مانع تھا۔ رکاوٹ صرف یہی تھی کہ یہاں فعل مجہول کی قراءت سند و روایت سے ثابت نہیں تھی، لہٰذا کسی نے بھی اس کو نہیں پڑھا۔ اس سے یہ حقیقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ متنوع قراءات کا سرچشمہ وحی اور براہ راست اخذ و سماع کے سوا کچھ نہیں ہے اور مصاحف کے حرکات سے خالی ہونے کا قراءات کے ظہور میں قطعاً کوئی کردار نہیں ہے۔

آٹھویں مثال: قراء کا سورۃ الاعراف کی آیت ﴿وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا﴾ میں لفظ "الرشد" اور سورۃ الکہف کی آیت ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ میں لفظ "رُشْدًا" کی قراءت میں اختلاف ہے۔ بعض نے ان دونوں الفاظ کو راء کی پیش اور شین ساکن کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے راء اور شین کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لفظ "بخل"، "حزن" اور "سقم" کی طرح اس لفظ

میں یہ دو لغات ہیں۔ لیکن سورۃ الکہف کی آیت ﴿وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا﴾ اور اسی سورۃ کی آیت ﴿لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا﴾، سورۃ الجن کی آیت ﴿أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾، اسی سورۃ کی آیت ﴿فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا﴾ اور اسی سورۃ کی آیت ﴿لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا﴾ میں لفظ "رَشَدًا" کو تمام قراء نے بالاتفاق راء اور شین کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔

اسی طرح سورۃ الجن کی آیت ﴿يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ﴾ میں بھی تمام قراء نے بالاتفاق اس لفظ کو راء کی پیش اور شین ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ مذکورہ تمام مقامات میں یہ لفظ خواہ نکرہ استعمال ہوا ہے یا معرفہ، اس کی قراءت میں اتفاق ہے یا اختلاف، اس کا معنی بہر حال ایک ہے۔ ہر جگہ یہ لفظ حق، خیر وصلاح اور راہ صواب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اگر قراءات قرآنیہ رسم مصحف کے حرکات وسکنات سے خالی ہونے کا نتیجہ ہوتیں تو یہ لفظ مذکورہ بالا تمام مواقع پر دو قراءتوں کے ساتھ پڑھا جاتا، عربی لغت میں ان دونوں قراءتوں کی گنجائش موجود ہے۔ اور معنوی اعتبار سے بھی دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تو قراء کا بعض جگہ اس لفظ کو ایک ہی انداز سے پڑھنا اور بعض جگہ دو طریقوں سے پڑھنا، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قراءات کی بنیاد نقل صحیح ہے۔ اور اس میں رسم مصحف کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

<u>نویں مثال:</u> لفظ "ضَرًّا" قرآن کریم میں درج ذیل مقامات پر آیا ہے پہلی دفعہ سورۃ المائدہ کی آیت ﴿قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا﴾ میں، دوسری مرتبہ سورۃ الاعراف کی آیت ﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾ میں، تیسری بار سورۃ یونس کی آیت ﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾ میں، چوتھی دفعہ سورۃ طٰہٰ کی آیت ﴿أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا﴾ میں، پانچویں مرتبہ سورۃ الفرقان کی آیت ﴿وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا﴾ میں، چھٹی بار سورۃ سبا کی آیت

﴿فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا﴾ میں، ساتویں دفعہ سورۃ الفتح کی آیت ﴿إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا﴾ میں، آٹھویں بار سورۃ الجن کی آیت ﴿قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور سوائے سورۃ الفتح کے ہر جگہ تمام قراء نے بالاتفاق اسے ضاد کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۃ الفتح میں بعض نے اسے ضاد کی زبر اور بعض نے ضاد کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغات ہیں۔ اور دونوں ضرر اور نقصان کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قراءات میں رائے اور اجتہاد کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ سراسر وحی ہیں اور اس کی بنیاد سند اور نقل صحیح پر ہے۔

<u>دسویں مثال:</u> لفظ "حـزن" قرآن کریم میں معرفہ اور نکرہ کے طور پر پانچ جگہ استعمال ہوا ہے۔ پہلی دفعہ سورۃ التوبہ کی آیت ﴿وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا﴾ میں، دوسری مرتبہ سورۃ یوسف کی آیت ﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ﴾ میں، تیسری بار سورۃ یوسف کی آیت ﴿قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ میں، چوتھی دفعہ سورۃ القصص کی آیت ﴿فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا﴾ میں، پانچویں مرتبہ سورۃ الفاطر کی آیت ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ خواہ معرفہ استعمال ہو یا نکرہ، اس میں دو لغات ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہی ہے، ایک لغت حاء کی پیش اور زاء ساکن کے ساتھ ہے اور دوسری حاء کی زبر اور زاء ساکن کے ساتھ ہے۔ لیکن قراء نے صرف سورۃ القصص میں اس لفظ کی قراءت میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے اسے حاء کی پیش اور زاء ساکن کے ساتھ اور بعض نے حاء اور زاء دونوں کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن سورۃ التوبہ اور سورۃ فاطر میں اس لفظ کو قراء نے بالاتفاق حاء اور زاء کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۃ یوسف کے دونوں مقامات پر حاء کی پیش اور زاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس حقیقت کی سب سے واضح دلیل ہے کہ قراءات کا دار و مدار نقل و روایت پر ہے، رسم الخط پر قطعاً نہیں ہے۔

گیارھویں مثال: لفظ "عمیت" ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ دو جگہ ذکر ہوا ہے۔ پہلی دفعہ سورۃ ہود کی آیت ﴿فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ﴾ اور دوسری دفعہ سورۃ قصص کی آیت ﴿فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ ہود میں واقع لفظ کی قراءت میں تو قراء کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسے عین کی پیش اور میم مکسورہ کی تشدید کے ساتھ "فَعُمِّيَتْ" پڑھا ہے اور بعض نے میم کی زیر اور میم مکسورہ ساکن کے ساتھ "فَعَمِيَتْ" پڑھا ہے۔ لیکن سورۃ قصص میں تمام قراء نے اس لفظ کو بالاتفاق عین کی فتح اور میم ساکن کے ساتھ "فَعَمِيَتْ" ہی پڑھا ہے۔

اگر قراءات کا اختلاف رسم کا مرہون منت ہوتا تو پھر مذکورہ دونوں مقامات پر قراء کا اختلاف ہونا چاہیے تھا۔ ایک مقام پر اختلاف اور ایک مقام پر اتفاق، اس کی توجیہ سوائے اس کے ممکن نہیں ہے کہ قراءات کی بنیاد یقیناً نقل تواتر اور سماع ہے، رسم مصحف کا حرکات سے خالی ہونا ہرگز نہیں ہے۔

بارھویں مثال: لفظ "نسقی" ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ چار بار آیا ہے۔ پہلی دفعہ سورۃ النحل کی آیت ﴿نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ﴾ میں، پھر سورۃ المومنون کی آیت ﴿نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا﴾ میں، اس کے بعد سورۃ الفرقان کی آیت ﴿وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا﴾ میں اور اس کے بعد سورۃ القصص کی آیت ﴿لَا نَسْقِي حَتَّى يُصْدِرَ الرِّعَاءُ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النحل اور سورۃ المومنون میں لفظ "نسقیکم" کے بارے میں قراء نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے دونوں جگہ نون کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے تو بعض نے دونوں جگہ نون کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے دونوں جگہ نون کی جگہ تاء کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن سورۃ الفرقان میں تمام قراء نے بالاتفاق نون کی پیش کے ساتھ "نُسْقِيَهُ" پڑھا ہے۔ حالانکہ اس لفظ کا رسم بھی نقطوں اور اعراب سے خالی ہونے کی وجہ سے مذکورہ دونوں الفاظ کی طرح تینوں قراءات کا احتمال رکھتا ہے۔ لیکن اس کلمہ میں تاء کے ساتھ قراءت آیت کے نظم و سیاق سے

مطابقت نہیں رکھتی ہے، لہٰذا کسی نے بھی اس قراءت کو نہیں پڑھا اور سب قراء نے بالاتفاق نون کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ اگرچہ لغوی اعتبار سے اس قراءت میں کوئی حرج نہ تھا، لیکن اس کے باوجود کسی نے بھی اس کے مطابق نہیں پڑھا۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ قراءۃ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں تھی۔

اسی طرح سورۃ القصص کی آیت ﴿قَالَتَا لَا نَسْقِي﴾ میں بھی اس لفظ کو تمام قراء نے بالاتفاق نون کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے، اگرچہ لغوی اعتبار سے پیش بھی درست ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں "سقاہ" (ثلاثی مجرد) اور "أسقاہ" (ثلاثی مزید فیہ) ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الدھر کی آیت ﴿وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا﴾، سورۃ الجن کی آیت ﴿لَأَسْقَيْنَاهُمْ مَاءً غَدَقًا﴾ اور سورۃ المرسلات کی آیت: ﴿وَأَسْقَيْنَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا﴾ میں یہ لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قراءات میں اعتماد کی اصل بنیاد سماع اور اتباع (وحی) ہے، اجتہاد واختراع قطعاً نہیں ہے۔

<u>تیرھویں مثال:</u> لفظ "کسفا" قرآن کریم میں پانچ دفعہ آیا ہے۔ پہلی دفعہ سورۃ الاسراء کی آیت ﴿أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا﴾ میں، اس کے بعد سورۃ الشعراء کی آیت ﴿فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ﴾ میں اور تیسری دفعہ سورۃ الروم کی آیت ﴿وَيَجْعَلُهُ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ﴾ میں، چوتھی دفعہ سورۃ سبا کی آیت ﴿إِنْ نَشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ﴾ میں اور پانچویں دفعہ سورۃ الطور کی آیت ﴿وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَرْكُومٌ﴾ میں استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ میں پہلے چار مقامات پر قراء کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسے سین کی زبر کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے سین ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن پانچویں مقام پر تمام قراء نے اس لفظ کو بالاتفاق سین ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسی نے سین کی زبر کے ساتھ نہیں پڑھا،

حالانکہ عربی زبان کی رو سے یہاں بھی سین کی زبر کے ساتھ پڑھا جاسکتا تھا اور آیت کا سیاق (Context) بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔ مقامِ غور یہ ہے کہ اگر مصاحف کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا اختلافِ قراءات کا باعث ہوتا تو سابقہ چار مقامات کی طرح اس جگہ بھی قراء کا اختلاف ممکن تھا۔ تو سابقہ چار مقامات پر اختلاف اور اس جگہ اتفاق اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قراءات میں تنوع درحقیقت نقل و روایت کی وجہ سے ہے، رسم الخط کی وجہ سے قطعاً نہیں ہے۔

چودھویں مثال: سورۃ طہٰ کی آیت ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا﴾ میں لفظ "ينفخ" کے بارے میں قراء کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسے فعل مجہول کے طور پر یاء کی پیش اور فاء کی زبر کے ساتھ "يُنْفَخُ" پڑھا ہے اور بعض نے اسے بحیثیت فعل معروف یاء کی بجائے نون کی زبر اور فاء کی پیش کے ساتھ "نَنْفُخُ" پڑھا ہے۔ لیکن سورۃ النمل کی آیت ﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ﴾ اور سورۃ النبأ کی آیت ﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا﴾ میں موجود اسی لفظ کو تمام قراء نے بالاتفاق یاء کی پیش اور فاء کی زبر کے ساتھ "يُنْفَخُ" ہی پڑھا ہے۔ حالانکہ سیاق و سباق کے اعتبار سے مذکورہ دونوں آیات میں نون کے ساتھ قراءت کی گنجائش موجود ہے۔ خاص طور پر سورۃ النمل کی آیت میں نون کے ساتھ قراءت ماقبل آیات کے اسلوب کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہے۔ اگر تم چاہو تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ﴾ (النمل: 82) فرمانِ الٰہی: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (النمل: 86) تک پڑھ لو۔ پھر "أَخْرَجْنَا"، "بِآيَاتِنَا"، "نَحْشُرُ" اور "جعلنا" کے الفاظ پر اگر آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ نون کی زبر اور فاء کی پیش کے ساتھ قراءت کی ان کلمات کی ساتھ واضح مناسبت موجود ہے۔ بالکل اسی طرح سورۃ النبأ کی آیت میں نون کی قراءت ماقبل آیات

کے اسلوب کے بالکل مطابق ہے۔ قرآن کی یہ آیات ملاحظہ ہوں: ﴿وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝﴾ سورۃ النحل اور النبا کی مذکورہ آیات میں ذات الٰہی کی عظمت کا ترجمان نون جمع متکلم مذکورہ دونوں آیات میں "ننفخ" کی قراءت سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن ان دونوں آیات میں ائمہ قراء میں سے کسی نے بھی اس لفظ کو نون کے ساتھ "ننفخ" نہیں پڑھا، کیونکہ ایسی کوئی قراءت سنداً ثابت نہیں ہے۔ اس سے یہ حقیقت پوری طرح مبرہن ہو جاتی ہے کہ ثبوت قراءات کا تمام تر انحصار نقل و روایت پر ہے، اجتہاد اور رائے کو اس سلسلے میں کوئی دخل نہیں ہے۔

<u>چودھویں مثال:</u> لفظ "سُخْرِيًّا" قرآن کریم میں تین جگہ آیا ہے۔ سورۃ المومنون کی آیت ﴿فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا﴾ سورۃ ص کی آیت ﴿أَتَّخَذْنَاهُمْ سِخْرِيًّا﴾ میں اور سورۃ الزخرف کی آیت ﴿لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اول الذکر دو مقامات پر قراء کا اختلاف ہے۔ بعض نے اسے سین کی پیش اور بعض نے سین کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن تیسرے مقام پر تمام قراء نے اسے بالاتفاق سین کی پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ واضح رہے کہ یہ لفظ عربی لغت میں پیش اور زیر کے ساتھ دونوں طرح استعمال ہوا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ درست کہ مصاحف عثمانیہ نقطوں اور حرکات سے خالی رکھے گئے تھے، لیکن اگر قراءات کا باعث رسم مصحف ہوتا تو قراء پہلے دو مقامات کی طرح تیسرے مقام پر بھی اختلاف کرتے۔ پہلی دو جگہ اختلاف جبکہ تیسری جگہ اتفاق اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قراءات قرآنیہ کا باعث رسم مصحف قطعاً نہیں ہے، بلکہ قراءات کی تمام تر بنیاد سماع، نقل اور روایت ہے۔

اس حقیقت کی <u>مزید وضاحت</u> اس سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن کریم میں بکثرت ایسے

الفاظ موجود ہیں کہ نقطوں اور حرکات سے خالی ہونے کی بناء پر ان میں متعدد قراءات کا احتمال موجود ہے اور عربی لغت کے اعتبار سے بھی ان قراءات میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کے باوجود تمام قراء ان الفاظ میں ایک ہی قراءت پر متفق ہیں اور اس ایک قراءت کے سوا کوئی دوسری قراءت یہاں صحیح اور قابل اعتماد سند سے ثابت نہیں ہے۔ اور دیگر کچھ قراءات ایسی ہیں کہ رسم مصحف میں ان کی گنجائش ہونے کے باوجود، ان میں سے کوئی ایک بھی قراءت ایسی نہیں ہے جو کسی قابل اعتبار سند سے ثابت ہو۔ اس سلسلہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

1۔ "خطف یخطف" عربی زبان کی رُو سے اس میں دو لغات ہیں: ایک باب "عَلِمَ یَعْلَمُ" سے "خَطِفَ یَخْطَفُ" ہے اور دوسری باب "ضرب یضرب" سے "خَطَفَ یَخْطِفُ" ہے۔ لیکن تمام قراء نے اسے بالاتفاق باب "عَلِمَ یَعْلَمُ" سے "خَطِفَ یَخْطَفُ" ہی پڑھا ہے۔

2۔ "مُکث" جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا o﴾ عربی زبان کی رو سے یہاں میم کو زبر، زیر، پیش کے ساتھ تینوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ اور اس کے رسم میں بھی اس کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن تمام قراء نے بالاتفاق اسے میم کی پیش کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ اگر قراءات قرآنیہ میں رائے اور ذاتی پسند ناپسند کو ادنیٰ بھی دخل ہوتا یا کلمات قرآنیہ کا نقطوں اور اعراب سے خالی ہونا اختلاف قراءات کا باعث ہوتا تو مذکورہ دونوں کلمات کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہونا چاہیے تھا۔ پھر "خَطَفَ یَخْطِفُ" کیوں نہیں پڑھا گیا؟ لفظ "مکث" کی میم کو زبر اور زیر کے ساتھ کیوں نہیں پڑھا گیا؟ حالانکہ عربی لغت اس میں مانع تھی نہ رسم مصحف رکاوٹ تھا۔ اور یہاں قراءات کے اختلاف سے مفہوم میں بھی کوئی فرق واقع نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود تمام قراء کا بالاتفاق ایک ہی طریقے پر خَطِفَ یَخْطَفُ اور میم کی پیش کے ساتھ "مُکث" ہی پڑھنا اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قراءات قرآنیہ میں تنوع کا اصل باعث روایات صحیحہ، متصل اسانید،

نقل صریح اور براہ راست سماع ہے۔ اور قراءات قرآنیہ کے اس پورے سلسلے میں رائے، اجتہاد کی کوئی گنجائش ہے نہ رسم مصحف کے نقطوں اور حرکات سے خالی ہونے کا کوئی دخل اس میں ہے۔

3۔ لفظ "الرضاعة" قرآن کریم میں دو جگہ آیا ہے: ﴿لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (البقرة: 233) اور ﴿وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ (النساء: 23) میں۔ عربی زبان کی رو سے اس کو راء کی زبر اور زیر کے ساتھ دونوں طرح پڑھنا جائز ہے، لیکن کسی قاری نے بھی اسے راء کی زیر کے ساتھ نہیں پڑھا، بلکہ تمام قراء نے بالاتفاق اسے راء کی زبر کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔

4۔ عربی زبان و ادب کے معروف ادیب امام اصمعی رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے امام مازنی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ فرمان الٰہی: ﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝﴾ (القمر: 49) سے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ تو امام مازنی رحمہ اللہ نے جواب دیا:

"عربی لغت کی رو سے سیبویہ کے نزدیک اس میں نصب (زبر) کی بجائے رفع (پیش) زیادہ بہتر ہے۔ البتہ امام قراء نے رفع کی بجائے نصب کو ہی جائز قرار دیا ہے، لیکن ہم اسے نصب کے ساتھ اس لیے پڑھتے ہیں کہ قراءت کی بنیاد سنت ہے۔"

5۔ فرمان الٰہی: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ (النساء: 11) میں لفظ "يُوصِيكُم" کو اگر "وَصَّى يُوَصِّي تَوْصِيَةً" سے ماخوذ مانا جائے تو لغوی اعتبار سے اسے واؤ کی زبر اور صاد کی تشدید کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ لیکن اگر باب افعال: "أَوْصَى يُوْصِي إِيْصَاءً" سے ماخوذ مانا جائے تو واؤ ساکن اور صاد متحرک کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان دونوں لغات کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: فرمان الٰہی ہے: ﴿وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ﴾ (البقرة: 132)

یہاں "وَ وَصّٰی" کو دونوں واؤ کی فتح (زبر) اور صاد کی تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور باب افعال سے پہلی واؤ کی فتح (زبر) اور دوسری واؤ ساکن اور ان دونوں کے درمیان ہمزہ مفتوحہ اور صاد متحرک کے ساتھ "وَ أَوْصٰی" بھی پڑھا گیا ہے۔

اور فرمان الٰہی ہے: ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ: 182) اس میں لفظ "مُوْصٍ" کو باب تفعیل سے واؤ کی زبر اور صاد کی تشدید کے ساتھ "مُـوَصٍّ" بھی پڑھا گیا ہے اور اسے باب افعال سے واؤ ساکن اور صاد متحرک کے ساتھ "مُـوْصٍ" بھی پڑھا گیا ہے۔ مذکورہ آیات میں اگرچہ یہ دونوں لغات کے ساتھ استعمال ہوا ہے، لیکن لفظ "یُـوصِیکُـم" کو تمام قراء نے بالاتفاق ایک ہی لغت اور قراءت کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسے بھی دوسری لغت سے پڑھا جا سکتا تھا، لیکن آج تک کسی نے دوسری لغت کو قراءت قرار نہیں دیا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی صرف ایک ہی قراءت بیان ہوئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قراءات کا تمام تر انحصار نقل و روایت پر ہے، رسم اور رائے کو قراءات میں کوئی دخل نہیں ہے۔

6۔ عربی زبان و ادب کے یکتائے روزگار امام فراء نے اپنی کتاب معانی القرآن میں فرمان الٰہی: ﴿إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ﴾ (طہ: 69) کے ضمن میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی قاری یہاں لفظ "كَيْدُ" کو دال کی نصب (زبر) کے ساتھ پڑھتا تو "إِنَّ" اور "مَـا" کو ایک حرف شمار کرتے ہوئے ایسا کرنا جائز تھا، لیکن قرائے عشرہ (قراءات متواترہ کے دس معروف قراء) میں سے کسی نے اسے زبر کے ساتھ نہیں پڑھا، بلکہ دس کے بعد (قراءات شاذہ کے) چار معروف قراء میں سے بھی کسی قاری نے اس قراءت کو جائز قرار نہیں دیا، حالانکہ لغوی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

امام موصوف نے فرمان الٰہی: ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا﴾ (الکہف: 6) کے ضمن میں مزید لکھا ہے کہ "یہاں تمام قراء نے کسرہ (زیر) کے ساتھ "إِنْ" پڑھا ہے، اگر اسے "إذ لم یؤمنوا" یا "لأن لم یؤمنوا" یا "من أن لم

یؤمنوا" کے معنی میں فتح (زبر) کے ساتھ "أن" پڑھ لیا جاتا تو لغوی اعتبار سے درست تھا، لیکن تمام قراء نے اسے بالاتفاق زیر کے ساتھ "إنّ" ہی پڑھا ہے۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ بعض ائمہ قراء نے نقل وروایت کی اتباع، سنت پر عمل اور براہ راست سماع کی پیروی کرتے ہوئے بعض الفاظ میں رسم مصاحف عثمانیہ کے خلاف پڑھا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

1۔ لفظ ﴿الصراط﴾ کو پورے قرآن میں معرفہ اور نکرہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ اسی طرح ﴿وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ﴾ (البقرۃ: 245)، ﴿وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً﴾ (الأعراف: 69) ﴿أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ﴾ (الطور: 37)، ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (الغاشیۃ: 22) میں تمام الفاظ مصاحف عثمانیہ میں صاد کے ساتھ لکھے گئے تھے۔ اس کے باوجود بعض قراء نے انہیں سین کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے زای کی آواز سے صاد کے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور تینوں قراءات متواتر ہیں۔

2۔ سورۃ ہود کی آیت ﴿أَلَا إِنَّ ثَمُودَا كَفَرُوا رَبَّهُمْ﴾، سورۃ الفرقان کی آیت ﴿وَعَادًا وَثَمُودَا وَأَصْحَابَ الرَّسِّ﴾، سورۃ العنکبوت کی آیت ﴿وَعَادًا وَثَمُودَا وَقَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ﴾ اور سورۃ النجم کی آیت ﴿وَثَمُودَا فَمَا أَبْقَى﴾ میں لفظ "ثَمُودَ" تمام مصاحف عثمانیہ میں دال کے بعد الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے، لیکن بعض قراء نے اس کے باوجود سنت کی پیروی میں اسے حذف الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۃ الانسان کی آیت 15،16 میں لفظ "قَوَارِيرَا" دونوں جگہ تمام مصاحف عثمانیہ میں راء کے بعد الف کے ساتھ لکھا گیا تھا، لیکن بعض قراء نے اسے حذف الف کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں کلمات میں حذف الف کے ساتھ پڑھنا بھی قراءۃ متواترہ ہے۔

3۔ سورۃ التوبہ کی آیت ﴿إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ﴾ میں لفظ "إِلَّا" تمام مصاحف میں

بطور حرف استثناء اسی طرح لکھا ہوا ہے، لیکن بعض قراء نے اسے بطور حرف جر "إِلَى" پڑھا ہے۔ اور یہ قراءت بھی اسی طرح متواتر ہے۔

4۔ سورۃ مریم کی آیت ﴿لِأَهَبَ لَكِ﴾ میں لفظ "لِأَهَبَ" تمام مصاحف میں لام کے بعد الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے، لیکن بعض قراء نے نقل اور سماع کی اتباع کرتے ہوئے اسے لام کے بعد یاء کے ساتھ "لِيَهَبَ" پڑھا ہے۔

5۔ لفظ "الْأَيْكَةِ" سورۃ الشعراء کی آیت ﴿كَذَّبَ أَصْحَـٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ﴾ میں اور سورۃ صٓ کی آیت ﴿وَأَصْحَـٰبُ لْـَٔيْكَةِ أُولَـٰئِكَ الْأَحْزَابُ﴾ میں تمام مصاحف عثمانیہ میں لام سے قبل حذف الف کے ساتھ یوں "لیکہ" لکھا گیا ہے۔ لیکن بعض قراء نے اسے لام سے پہلے ہمزہ وصلی کے حذف اور لام کی فتح (زبر) اور اس کے بعد یائے ساکنہ کے ساتھ "لَيْكَةَ" پڑھا ہے۔ یہ قراءۃ رسم کے مطابق ہے۔ اور بعض قراء نے اسے اسی طرح "الْأَيْكَةِ" یعنی ہمزہ وصل اور لام ساکن کے ساتھ اور اس کے بعد ہمزہ کی فتح (زبر)، یاء ساکنہ اور تاء کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قراءت بظاہر تمام مصاحف عثمانیہ کے رسم کے خلاف ہے، لیکن پہلی قراءت کی طرح بطریق تواتر ثابت ہے۔

مذکورہ حقائق سے یہ بات بغیر کسی ادنیٰ شبہ کے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنی الفاظ کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا، اس کا قراءات کے اختلاف اور تنوع میں قطعاً کوئی عمل دخل تھا اور نہ کبھی رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر وہ قراءت درست قرار پاتی جو لغت عربی سے ہم آہنگ تھی اور مصاحف عثمانیہ کا رسم جس کا متحمل تھا، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ متعدد ایسے کلمات قرآنیہ ہیں جن کا رسم نقطوں اور حرکات سے خالی ہونے کی وجہ سے ایک سے زائد قراءات کی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے، لیکن ان میں سے صرف ایک ہی قراءت صحیح ہے، اور اس ایک کے علاوہ کسی بھی قراءت کو باوجود عربی لغت کے ساتھ مطابقت کے کسی نے جائز قرار نہیں دیا ہے، جیسا کہ گزشتہ مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ تو اب اس

حقیقت کو مان لینے میں آخر کیا رکاوٹ ہے کہ قراءات قرآنیہ کا تمام تر دارومدار روایات متواترہ، آثار صحیحہ اور وہ قابل اعتماد اور مضبوط اسانید ہیں جو ثقہ اور علم و کردار کے پیکر قراء سے نسل در نسل روایت ہوتی آئی ہیں۔ اور رسم و کتابت کو قراءات قرآنیہ کے اس پورے سلسلے میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

گزشتہ پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بھی قراءت اس وقت تک قراءت تسلیم کی جا سکتی نہ اسے قرآن قرار دیا جا سکتا ہے، جب تک کہ وہ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو اور اس کا مرکز ومحور سماع اور نقل در نقل نہ ہو۔ اور رسم و کتابت کا اس سلسلہ میں قطعاً کوئی کردار نہیں ہے۔

چنانچہ امام ابو شامہ رحمہ اللہ شاطبیہ کی شرح میں لفظ "ولؤلؤا" (الحج: 23) پر بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''سورۃ الحج میں "لؤلؤا" میں الف کے ساتھ رسم ہے، جبکہ سورۃ فاطر میں یہ لفظ الف کے ساتھ نہیں ہے اور قراءت تو نقل روایت کا نام ہے۔ جہاں نقل، رسم کے موافق ہوگی تو مزید مضبوط ہو جائے گی اور نقل کی تائید کے بغیر محض رسم کی اتباع میں قراءت کرنا درست نہیں ہے۔ اگر رسم، نقل کے مطابق ہو جائے تو یہ کیا ہی خوب ہے۔ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ہے۔''

امام شاطبی رحمہ اللہ کے شاگرد الشیخ سخاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''یہ مقام اس حقیقت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ قراءات قرآنیہ میں نقل وروایت پر انحصار کیا گیا ہے۔ اگر قراء نے اس سلسلہ میں رسم الخط کا سہارا لیا ہوتا تو وہ سورۃ الحج میں اس لفظ کو الف کے ساتھ پڑھتے اور سورۃ فاطر میں لفظ "لؤلؤ" کو زیر کے ساتھ پڑھتے۔''

اور امام ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اگر قراء سے اختلاف کرنا میرے نزدیک ناپسندیدہ نہ ہوتا تو یہاں رسم الخط

کی اتباع مجھے زیادہ محبوب ہوتی۔ پس میں سورۃ الحج میں فتحہ اور سورۃ فاطر میں کسرہ پڑھتا۔"

چوتھی دلیل:

گولڈ زیہر اور اس کے ہم نوا ملحدین کی یہ رائے کہ قراءات کا باعث مصاحف کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا تھا، اگر تسلیم کر لی جائے تو اس کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ گویا قرون اولیٰ یعنی نبی ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے دور میں قرآن کریم کو مختلف طریقوں میں پڑھا گیا، لیکن ان میں سے صحیح و غیر صحیح، متواتر و غیر متواتر قراءات کے درمیان کوئی تمیز تھی نہ اس بارے میں کوئی امتیاز کہ کون سی قراءات اللہ کی طرف سے نازل شدہ اور کون سی اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عقل سلیم گولڈ زیہر کے اس تصور کو سراسر باطل قرار دیتی ہے۔ اس عظیم مدبر اور حکیم ذات الٰہی کی حکمت کے منافی ہے کہ وہ قرآن کریم ایسے عظیم آسمانی دستور کو انسانوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دے کہ وہ اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور خواہش ورجحان کے مطابق جس طرح چاہیں اسے پڑھ لیں اور اپنی مرضی سے جو اسلوب اور تعبیر چاہیں اختیار کر لیں۔ اور اسے اپنی آراء اور خیالات کا ایک چیستاں بنا دیں۔ نہیں، ہرگز نہیں، یہ موہوم تصور اس علیم وحکیم ذات کی حکمت وقدرت کے سراسر خلاف ہے کہ نص قرآنی تناقض وتعارض، انسانی دست برد، تحریف وتبدیلی اور اغلاط وتصحیفات کی آماجگاہ بن جائے، (جبکہ اس مدبر کائنات نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود اٹھا رکھا ہو) کوئی ذی ہوش انسان اس خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔

پانچویں دلیل:

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قراءات (متواترہ) کا یہ اختلاف رسم مصاحف کا مرہون منت ہے۔ رسم مصحف کے تناظر میں ہر قاری کو اپنی خواہش کے مطابق قرآن کو پڑھنے کی آزادی حاصل تھی اور قراءات قرآنیہ کو وحی اور زبان نبوت سے براہ راست حاصل کرنا

ضروری نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کا بعض حصہ انسانی کلام پر مشتمل ہے۔ اور سارا قرآن وحی آسمانی اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے۔ اگر اس وسوسہ شیطانی کو مان لیا جائے تو پھر بتایئے کہ قرآن کریم کا وہ اعجاز کہاں رہا کہ کائنات کے جن وانس مل کر بھی اس جیسی ایک سورت نہیں بنا سکتے ؟ کیا قرآن کریم اپنے اس چیلنج سے دستبردار ہو گیا ہے؟ اس تاریخی حقیقت کی آخر کیا توجیہ پیش کرو گے کہ عربوں نے اعجاز قرآن کے سامنے اپنی بے بسی کا خود اعتراف کر لیا تھا؟ کیا قرآن کریم کی تلاوت اب درجۂ عبادت وثواب سے محروم ہو گئی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! قرآن کریم کا عرب وعجم کو چیلنج آج بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم پر باقاعدہ ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور اس کی تلاوت کو کار ثواب اور عبادت قرار دیا ہے۔ اگر بقول گولڈ زیہر قرآن کریم میں انسانی کلام کی آمیزش ہو گئی ہے تو پھر انسانیت کو اس کی نظیر پیش کرنے کا چیلنج، اس پر ایمان کی فرضیت اور اس کی تلاوت پر ایک حرف کے بدلے دس نیکیوں کا وعدہ چہ معنی دارد؟ ان حقائق کی کوئی توجیہ سوائے اس کے ممکن نہیں ہے کہ قرآن کریم الحمد سے لے کر الناس تک پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور اس میں کلام بشری کی آمیزش کا تصور بھی محال ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ قراءات قرآنیہ کا باعث رسم مصاحف کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ان کا اصل سرچشمہ وحی الٰہی اور رسول اللہ ﷺ کی زبان نبوت ہے۔

چھٹی دلیل:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آپ بھی قرآن کریم کے کسی ایک لفظ اور حرف میں تبدیلی کے مجاز نہیں ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ میرے لیے اس کے ایک حرف کو بدلنا بھی محال ہے۔ اور واضح کر دیا کہ قرآن کریم میں ادنیٰ تبدیلی بھی میرے لیے شدید اخروی سزا کا موجب بن سکتی ہے۔ اس حقیقت پر قرآن کریم کی یہ آیت شاہد عدل ہے:

﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴾ (یونس: 15)

''اور جب ہماری صاف صاف باتیں ان کے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے محمد کریم ﷺ! ان سے کہو، میرے بس میں نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم یا تبدیلی کر لوں۔ میں تو اس وحی کا پابند ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے خوفناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔''

اور سورۃ الحاقہ میں فرمایا:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝﴾ (الحاقۃ: 44-46)

''اگر اس پیغمبر نے خود گھڑ کر ہماری طرف کوئی بات منسوب کی ہوتی تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور ان کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔''

جب خود مہبط وحی رسول اللہ ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن کریم میں کسی قسم کا تغیر وتبدل ممکن نہیں تھا تو پھر کسی صحابی، تابعی یا کسی دوسرے کو یہ اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ کسی لفظ یا حرف میں ترمیم وتحریف کر سکے؟

ساتویں دلیل:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لیا کہ تحریف کا کوئی شائبہ بھی اس میں راہ نہ پا سکے، جیسا کہ کتب سابقہ محفوظ نہ رہ سکیں تھیں۔ چنانچہ سورۃ الحجر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝﴾ (الحجر: 9)

''بلاشبہ ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔''

اور سورۃ فصلت میں فرمایا:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (فصلت: 42)

''باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ ایک حکیم وحمید ذات کی نازل کردہ کتاب ہے۔''

اگر قراءات قرآنیہ میں رائے اور اختیار کا امکان تسلیم کر لیا جائے تو پھر قرآن میں تحریف اور تصحیف کا امکان بھی ماننا پڑے گا، لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی حفاظت کے وعدہ اور اس کی صفت ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ کے منافی ہے۔

آٹھویں دلیل:

یہ حقیقت ہر قسم کے شک سے مبرا انتہائی قطعی ذرائع سے ثابت ہو چکی ہے کہ قرآن اور قراءات قرآنیہ کے حفظ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انحصار مصحف پر قطعاً نہیں تھا، بلکہ انہوں نے اس کا ایک ایک حرف براہ راست زبان رسالت ﷺ سے سن کر حاصل کیا اور پھر اسے اپنے دل و دماغ پر نقش کر لیا تھا۔ قرآن کریم کے حفظ وضبط کے سلسلے میں ان کے ولولۂ شوق کا یہ عالم تھا کہ انہیں بارگاہِ ایزدی سے یہ اعزاز عطا ہوا کہ: ''أَنَاجِيلُهُمْ فِي صُدُورِهِمْ'' یعنی انہوں نے اللہ کی اس کتاب کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا ہے اور زبانی اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل کتاب اپنی کتب کو دیکھ کر پڑھتے ہیں، ان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی کتاب کو حفظ اور پھر اسے ہر وقت مستحضر رکھ سکیں۔

نویں دلیل:

جو شخص بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات، دین کے ساتھ ان کی محبت اور اپنے پروردگار کی کتاب کے ساتھ ان کی گہری عقیدت سے واقف ہے تو وہ اس حقیقت کو جانتا ہے کہ صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم قرآن کریم کو اپنی زندگی کا دستور، اپنی سعادت کا محور اور اپنے پیغمبر کا معجزہ سمجھتے تھے۔ اس نسخہ کیمیا کی خاطر انہوں نے اپنے وطن اور بچوں کی جدائی کے غم اٹھائے تھے، مال دولت اور جاہ وحشمت کی قربانی دی تھی، بلکہ انہوں نے اس کے دفاع میں اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کیا۔ ان حقائق کو جاننے والا ہر شخص یہ گواہی دے گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پورے ایمان ویقین کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ قرآن کریم وحی آسمانی ہے اور قطعاً کسی انسان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر وہ سمجھتے کہ کسی آدمی کا اس میں کمی بیشی اور تبدیلی وتحریف کے حوالے سے کوئی دخل ہے تو قرآن کریم ان کے ہاں مختلف نظریات اور مذاہب کا ایک چیستاں بن جاتا۔ اور ان کی انکار پسند طبیعتیں کبھی اس کے اتباع، اسے دستور و قانون ماننے اور اپنا آپ اس کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہوتیں کیونکہ وہ آزاد طبع لوگ تھے، غلامی اور کسی تسلط کو قبول کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

دسویں دلیل:

قرائے عشرہ کے ایک معروف قاری امام ابو عمرو بن العلا البصری رحمہ اللہ ہیں۔ عربی زبان و ادب کے بلند پایہ عالم اور درجہ امامت پر فائز تھے۔ دور دراز علاقوں سے سفر کر کے لوگ ان سے اخذ واستفادہ کے لیے آتے تھے۔ نحو میں باقاعدہ ایک مذہب (School of Thought) کے بانی قرار پائے۔ اس جلالت علمی کے باوجود جو قراءات اپنے اساتذہ اور شیوخ سے حاصل کیں، ان سے سرمو انحراف نہیں کیا، خواہ وہ قراءت ان کے اپنے نحوی مذہب کے خلاف ہی کیوں نہیں تھی۔ امام اصمعی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ابو عمرو رحمہ اللہ نے مجھ سے فرمایا:

''اگر یہ پابندی نہ ہوتی کہ میں ویسے ہی پڑھوں جیسا کہ پیش رو قراء نے پڑھا ہے تو میں فلاں فلاں حرف کو یوں یوں پڑھتا۔''

بیان کرتے ہیں کہ ابو عمرو رحمہ اللہ نقل وروایت کی اتباع میں اپنے نحوی نقطہ نظر کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے تھے۔

نیز ابن خالویہ رحمہ اللہ اپنی "کتاب الحجة" میں لکھتے ہیں:

’’تنہا ابو عمرو رحمہ اللہ نے ہی "یَغْفِرْ لَّکُمْ" اور اس کے مشابہ آیات میں راء کو لام میں ادغام کیا ہے، حالانکہ راء کا لام میں ادغام بصری نحویوں کے نزدیک کمزور موقف ہے۔(جبکہ ابو عمرو رحمہ اللہ خود نحاۃ بصرہ کے امام ہیں) ابو عمرو رحمہ اللہ کی طرح امام کسائی رحمہ اللہ کا بھی یہی معاملہ ہے۔بعض مقامات پر ان کی قراءت خود ان کے اپنے ہی نحوی موقف کے خلاف ہے۔‘‘

ان حقائق کی کوئی توجیہ سوائے اس کے ممکن نہیں ہے کہ فن قراءت کے ان ائمہ کے ہاں قراءت کا تمام تر دارومدار نقل و روایت پر تھا، قواعد نحویہ اور عقل و درایت پر قطعاً نہیں تھا۔امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے واضح لکھا ہے کہ

"مَا قَرَأَ حَمْزَةُ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَى إِلَّا بِأَثَرٍ، وَكَانَ لِيَحْيَى ابْنِ سَلَامٍ اخْتِيَارٌ فِي الْقِرَاءَةِ وَلَكِنْ مِنْ طَرِيقِ الْآثَارِ، وَكَانَ الْإِمَامُ أَبُو عُبَيْدٍ الْقَاسِمُ بْنُ سَلَامٍ يَخْتَارُ مِنَ الْقِرَاءَاتِ مَا يُوَافِقُ الْعَرَبِيَّةَ وَالْأَثَرَ جَمِيعًا."

’’کتاب اللہ میں امام حمزہ رحمہ اللہ کی قراءۃ کا ایک حرف بھی ایسا نہیں، جس کی پشت پر کوئی نہ کوئی اثر و نقل موجود نہ ہو۔یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ کے ہاں اگرچہ قراءات کے انتخاب کا ایک معیار تھا، لیکن اس کی تمام تر بنیاد آثار وروایات پر تھی اور امام ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ صرف انہیں قراءات کا انتخاب کرتے جو بیک وقت عربی لغت اور نقل واثر کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی تھیں۔‘‘

گیارھویں دلیل:

امت مسلمہ ہمیشہ اس بات پر متفق رہی ہے کہ ائمہ عشرہ کی قراءات متواتر ہیں اور یہ تمام قراءات رسول اللہ ﷺ سے یقینی اور قطعی ذرائع سے ثابت ہیں۔متواتر سے مراد، جیسا کہ علمائے اصول نے اس کی تعریف کی ہے، اتنی بڑی تعداد کسی معاملے پر اتفاق کرلے کہ ان کا جھوٹ پر اتفاق کرلینا یا اتفاقاً ان سے جھوٹ کا سرزد ہونا عادتاً محال ہو۔اور خبر متواتر سے مراد

وہ خبر ہے، جسے نقل کرنے والی اتنی کثیر تعداد ہو کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا ممکن نہ ہو اور یہ تعداد شروع سند سے لے آخر سند تک ہر طبقہ میں موجود ہو۔ نیز اس خبر کا تعلق مشاہدہ یا سماع سے ہو۔ واضح رہے کہ تواتر اس وقت تک ثابت نہیں ہو گا، جب تک کہ مطلوبہ تعداد آغاز سے انتہاء تک تمام طبقات میں موجود نہ ہو۔ اگر یہ تعداد سند کے کسی طبقہ میں مفقود ہوئی تو تواتر اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔ خبر متواتر اپنے سامعین کو علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ائمہ عشرہ کی قراءات یقینی اور قطعی ہیں۔ قراءات عشرہ کے ان دس ائمہ کے نام یہ ہیں:

نافع بن ابونعیم المدنی، ابوجعفر یزید بن ابو القعقاع المدنی، عبداللہ بن کثیر المکی، ابوعمرو بن العلا البصری، یعقوب بن اسحاق البصری، عبداللہ بن عامر الشامی، عاصم بن ابی النجود، حمزۃ بن حبیب الزیات، علی بن حمزۃ الکسائی اور خلف بن ہشام البزار رحمہم اللہ اجمعین۔ مؤخر الذکر تینوں قراء اہل کوفہ میں سے ہیں۔

ان ائمہ کی قراءات کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا تھا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ تمام قراءات براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے حاصل کی تھیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آگے تابعین نے انہیں روایت کیا، اور تابعین سے تبع تابعین نے اور ان سے مذکورہ بالا ائمہ کرام نے یہ قراءات حاصل کیں۔ پھر ان ائمہ سے ہر دور میں اتنی بڑی تعداد نے یہ قراءات روایت کیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔ کوئی ایسی قوم نہیں گزری، کوئی ایسا دور نہیں آیا اور کوئی ایسا علاقہ نہیں تھا جہاں ایک جم غفیر نے ائمہ عشرۃ کی قراءات کو اگلی نسل تک منتقل نہ کیا ہو اور اسی جم غفیر کو لیے ہوئے یہ سلسلہ ہم تک پہنچا ہے۔ اور ان شاء اللہ امت مسلمہ روز قیامت تک اسی طرح ان قراءات کی حفاظت اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا فرض انجام دیتی رہے گی۔ کیونکہ اللہ کریم کا یہ وعدہ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ﴾ (الحجر: 9)

"بے شک ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔"

قراءات عشرۃ کے تواتر پر مزید دلائل:

1۔ یہ تمام قراءات قرآن کریم کا جز اور حصہ (اور شجر اسلام کے برگ و بار) ہیں اور قرآن کریم اپنے ایک ایک جز سمیت تمام کا تمام، یعنی شجر اسلام کی ایک ایک کلی، تواتر سے ثابت ہے۔ اس لیے کہ جب قرآن کریم بحیثیت مجموعی تواتر سے ثابت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا ایک ایک جز بھی تواتر سے ثابت ہو۔ مثلاً لفظ "الصِّرَاط" میں صاد کے ساتھ قراءت بھی قرآن کا حصہ ہے، اور سین کے ساتھ قراءت بھی قرآن کا حصہ ہے اور یہ دونوں قراءات متواترہ ہیں، کیونکہ جس ذریعہ سے ایک قراءت ہم تک پہنچی ہے، دوسری بھی اسی ذریعہ سے پہنچی ہے۔ جب دونوں قراءات کا ماخذ ایک ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دونوں قرآن ہیں۔ ان میں سے ایک کو متواتر کہنا اور دوسری کو متواتر تسلیم نہ کرنا، جبکہ دونوں ایک ہی ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں، جھوٹی انانیت اور سینہ زوری کے سوا کچھ نہیں۔ دو ہم پلہ اور مساوی قراءات میں ایک کو بغیر کسی ثبوت کے دوسری پر ترجیح دینا سراسر باطل سوچ ہے۔ اگر ایک کو متواتر مانتا ہے تو دوسری کو بھی متواتر ماننا پڑے گا۔

2۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) ''قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اسے متعدد طرق (ذرائع) سے بیان کیا ہے جو انتہائی باوثوق ہیں اور مجموعی اعتبار سے اس حدیث کے تواتر کو ثابت کرتے ہیں۔ بلکہ بعض علماء نے تو واضح طور پر اس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے۔ ان میں سرفہرست امام قاسم بن سلام رحمہ اللہ، امام حاکم نیسابوری رحمہ اللہ ہیں اور امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "الاتقان" اور "تدریب الراوی" میں اس حدیث کے تواتر کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ اس حدیث کے تواتر کی بنیاد پر یہ بات قطعی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے سات حروف پر نازل کیا گیا تھا۔ نیز دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ

قراءات عشرۃ کے علاوہ تمام قراءات منسوخ قرار دے دی گئیں تھیں۔ صرف یہی قراءات عشرۃ باقی رہ گئیں، جو قطعی اور یقینی ذرائع سے ثابت ہو چکی ہیں۔

قراءات عشرۃ کے تواتر پر علماء کی تصریحات:

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عالم اسلام کے تمام علاقوں میں علمائے کرام کا اس حقیقت پر اجماع ہے کہ ائمہ عشرہ نے جو قراءات روایت کی ہیں یا انہیں اپنی تصنیفات میں تحریر کیا ہے، ان پر اعتماد کیا جائے گا اور ان قراءات کے صحیح ہونے پر ہر زمانہ میں اجماع چلا آ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا ہوا ہے۔ نیز ابن جریر الطبری، قاضی ابوبکر بن ابوالطیب اور دیگر تمام محققین علماء اور ائمہ سلف بھی اسی موقف کے حامل ہیں۔''

قاضی ابوبکر بن ابوالطیب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الانتصار" میں واضح لکھا ہے:

"لم يقصد عُثمان رضى الله عنه قصد أبى بكر فى جمع نفس الـقُرآن بين لوحين وَإِنَّمَا قصد جمع الصَّحَابَة على الْقرَاءَات الثَّابِتَة الْـمَـعْرُوفَة عَن النبى صلى الله عَلَيْهِ وَسلم وإلغاء ما ليس كذلك."

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کو محض دو گتوں کے درمیان جمع کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، بلکہ ان کا مقصد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ متواتر اور معروف قراءات پر جمع کرنا اور دیگر شاذ اور منسوخ قراءات کو ان سے الگ کرنا تھا۔''

ابن عطیہ اندلسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''عالم اسلام کے ہر علاقہ میں اور تاریخ اسلام کے ہر دور میں ائمہ سبعہ، بلکہ ائمہ عشرہ کی قراءات کو قرآن سمجھا گیا اور ان کو نمازوں میں پڑھا گیا، کیونکہ یہ قراءات

امت مسلمہ کے اجماع سے ثابت ہیں۔"

فن قراءۃ کے امام اور عظیم محقق ابن الجزری رحمہ اللہ اپنی کتاب "منجد المقرئین" میں لکھتے ہیں:

"علامہ ابن السبکی رحمہ اللہ کے بقول: قراءات سبعہ کہ جن پر امام شاطبی رحمہ اللہ نے اکتفا کیا ہے اور تین مزید قراءات یعنی ابو جعفر، امام یعقوب اور امام خلف کی قراءات یہ سب متواتر اور قطعی ہیں۔ اور ان کا ایک ایک حرف اور جز اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ ان سے دشمنی اور عناد صرف وہی شخص رکھ سکتا ہے جو جاہل ہے۔ نیز ان کا تواتر صرف ان قراء کی حد تک محدود نہیں ہے جنہوں نے ان روایات کو پڑھا ہے، بلکہ یہ تمام قراءات ہر اس مسلمان کے نزدیک متواتر ہیں جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ایک اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، خواہ وہ کوئی عام ان پڑھ آدمی ہو اور قرآن کا ایک حرف بھی اسے یاد نہ ہو اور ہر مسلمان کے اوپر یہ فرض ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین تسلیم کرے اور اس کا دل اس پر یقین کرے کہ جن قراءات کا ہم نے ذکر کیا ہے، وہ سب متواتر اور یقینی طور پر ثابت ہیں۔ ان کے کسی ایک جز میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔"

امام ابن جزری رحمہ اللہ "منجد المقرئین" میں مزید لکھتے ہیں:

"ہر وہ قراءۃ متواتر اور قطعی ہے جو لغت عربی کے مطابق ہو۔ مصاحف عثمانیہ میں سے کسی ایک کے رسم کے موافق ہو، خواہ یہ موافقت تقدیری ہی کیوں نہ ہو اور وہ بذریعہ تواتر نقل ہوئی ہو۔ عربی لغت سے مطابقت کا معنی یہ ہے کہ وہ قراءۃ کسی نحوی قاعدہ کے مطابق ہو، جیسے امام حمزہ رحمہ اللہ کی قراءت "وَالْأَرْحَامِ" (النساء: 1) جر کے ساتھ، اور امام ابو جعفر رحمہ اللہ کی قراءۃ: "لِيُجْزَىٰ قَوْمًا"

(السحائیۃ: 14) ہے۔ اور مصاحفِ عثمانیہ میں سے کسی ایک کے ساتھ موافقت کا معنی یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصاحف مدون کر کے قراء صحابہ رضی اللہ عنہم کی معیت میں مختلف علاقوں کی طرف بھیجے تھے، وہ قراءۃ ان میں سے کسی ایک کے رسم کے مطابق ہو، جیسا کہ سورۃ التوبہ میں ابن کثیر مکی کی قراءۃ: ﴿جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (التوبة: 72) "مِنْ" کے اضافہ کے ساتھ صرف اس مصحف میں ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ کی طرف بھیجا تھا۔ اور تقدیری موافقت سے مراد یہ ہے کہ مصحف عثمانی کے رسم میں اس قراءۃ کا احتمال موجود ہو، جیسا کہ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ (الفاتحة: 4) میں الف کے ساتھ "مَالِكِ" کی قراءت، رسم عثمانی کے ساتھ اس کی مطابقت تقدیری ہے، کیونکہ یہ لفظ تمام مصاحف عثمانیہ میں الف کے بغیر "مٰـــلِكِ لکھا ہوا ہے۔ اس میں اسم فاعل کے وزن پر "مــالك" کی قراءت کا احتمال بھی موجود ہے، لہٰذا یہ موافقت تقدیری ہے۔ اختصار کے طور پر الف کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔ اور تواتر سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس قراءۃ کو شروع سے لے کر آخر تک سند کے ہر طبقہ میں ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہو اور اس سے یقینی علم حاصل ہو رہا ہو۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں تعداد کی کوئی تعیین نہیں ہے لیکن بعض کے نزدیک اس میں تعداد کا تعین ضروری ہے۔ اس کے بعد تعداد کے تعین میں بھی ان کے درمیان اختلاف ہے۔ کسی کے نزدیک اس جماعت کے افراد کی تعداد چھ، کسی کے نزدیک بارہ، کسی کے نزدیک چالیس اور بعض نے ستر کا بھی ذکر کیا ہے۔ البتہ ہمارے اس دور میں ان تین ارکان کی جامع صرف ائمہ عشرۃ کی قراءات ہیں جن کے قبولِ عام پر تمام امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ اور وہ دس ائمہ یہ ہیں: ابو جعفر، نافع، ابن کثیر، ابو عمرو، یعقوب، ابن عامر، عاصم، حمزۃ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ۔ بعد والوں نے ان قراءات کو سلف سے حاصل کیا اور نسل در نسل یہ

سلسلہ چلتا ہوا بالآخر ہم تک پہنچا ہے، جیسا کہ ابھی ہم اس کی وضاحت کریں گے۔ان میں سے ہر قراءۃ اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے اور قطعیت کے اعتبار سے ان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔''

ابن جزری رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے:

''وہ قراءات جو آج ہم تک تواتر اور قطعی ذریعہ سے پہنچی ہیں، وہ ائمہ عشرۃ اور ان کے مشہور راویوں کی قراءات ہیں۔علمائے اسلام کے اقوال سے بھی یہی حقیقت ثابت ہوتی ہے۔اور اسی پر آج اہل شام، عراق، مصر اور اہل حجاز کا اجماع ہے۔''

اس کے بعد ابن جزری رحمہ اللہ نے ائمہ اسلام کی ایک کثیر تعداد، جیسے محی السنہ ابو محمد حسن بن مسعود البغوی، یکتائے روزگار حافظ المشرق ابو العلاء، الحسن بن احمد ہمدانی، الحافظ مجتہد امت ابو عمرو بن الصلاح، الحافظ مجتہد العصر ابو العباس احمد بن تیمیہ، امام ابو الحسن السبکی، ان کے بیٹے قاضی القضاۃ اور ان جیسے دیگر کبار ائمہ رحمہم اللہ سے قراءات عشرۃ کا متواتر ہونا نقل کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر دور میں بے شمار انسانوں نے قرآن کریم کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کر کے اس کی قطعیت تاریخ کے چہرہ پر ثبت کر دی۔یہ قرآن کریم کی ایسی عظیم کامیابی ہے جو آج تک کسی آسمانی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔اس کی پشت پر موجود مسلسل تواتر نے شکوک شبہات کے پردوں کو چاک کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کی ہر ہر روایت اور قراءت کو زبان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا اور پھر اس کی ایک ایک قراءت اور طرز ادا کو جس ضبط اور امانت و دیانت کے ساتھ اگلی نسل تک منتقل کیا، تاریخ انسانی ہمیشہ اس پر رشک کرتی رہے گی۔قرآن کریم کے حفظ وضبط کا جو انتہائی مضبوط نظام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قائم کیا تھا، اس کی موجودگی میں اس کے کسی جملہ، کلمہ، حرف یا حرکت کے ضائع ہونے کا تصور بھی محال ہے۔نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے کسی

کلمہ کو دوسرے کلمہ یا کسی حرف کو دوسرے حرف سے بدلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر اسی شان کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعین نے اسے نقل کیا اور تابعین سے اگلی نسلوں نے نقل کیا۔ اور بغیر کسی تعطل کے نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا ہوا بالآخر ہم تک پہنچا۔ اور یوں ہی امت مسلمہ ہر دور میں اس کی حفاظت اور آئندہ نسلوں تک اسے منتقل کرنے کا فرض انجام دیتی رہے گی، یہاں تک کہ اس کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ اور بالآخر تاریخ کے چہرے پر یہ حقیقت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ثبت ہوگی:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ (الحجر: 9)

''بے شک ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔''

ان آیات کی حقیقت جن سے گولڈ زیہر نے استشہاد کیا ہے:

اب ان مثالوں کا جائزہ لیتے ہیں جو گولڈ زیہر (Ignaz Gold ziher) نے اپنے اس نظریہ (کہ رسم مصحف مختلف قراءات کا باعث بنا ہے) کی حمایت میں پیش کی ہیں:

1۔ سورۃ الاعراف کی آیت ﴿وَنَادٰى أَصْحٰبُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُم بِسِيمٰهُمْ قَالُوا مَا أَغْنٰى عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ﴾ کے بارے میں گولڈ زیہر نے لکھا ہے: ''اس میں لفظ ﴿تَسْتَكْبِرُونَ﴾ کو بعض نے ثاء مثلثہ کے ساتھ ''تَسْتَكْثِرُونَ'' پڑھا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ ﴿تَسْتَكْبِرُونَ﴾ کو باء کی بجائے ثاء مثلثہ کے ساتھ نہ قرائے عشرہ میں سے کسی نے پڑھا ہے اور نہ قراءات شاذہ کے چار قراء میں سے کسی نے اس طرح پڑھا ہے۔ لہٰذا نہ تو یہ قراءۃ متواترہ ہے نہ صحیح اور نہ ہی شاذ، بلکہ یہ خود ساختہ اور من گھڑت ہے۔ علمائے قراءات میں سے کسی کے ہاں بھی یہ قراءت قابل اعتنا اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ ائمہ قراءۃ میں سے کسی نے بھی اسے کوئی وزن نہیں دیا۔ اس قراءۃ کے قابل مسترد ہونے کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ یہ کسی مخصوص قاری یا راوی کی طرف منسوب نہیں ہے۔ اس سے یہ حقیقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ قراءات قرآنیہ کی اصل بنیاد نقل اور سند ہے، رسم الخط قطعاً نہیں ہے۔

2۔ اس سلسلہ کی دوسری مثال، اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ﴾ (الاعراف: 57) ہے۔

اس آیت میں لفظ ﴿بُشْـرًا﴾ کو امام عاصم رحمہ اللہ نے باء کی پیش اور شین ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دونوں مدنی قراء (امام نافع رحمہ اللہ اور امام ابو جعفر رحمہ اللہ)، ابن کثیر مکی رحمہ اللہ اور دونوں بصری قراء (ابو عمرو رحمہ اللہ اور یعقوب رحمہ اللہ) نے نون اور شین کی پیش کے ساتھ ﴿نُشُـرًا﴾ پڑھا ہے۔ ابن عامر رحمہ اللہ نے نون کی پیش اور شین ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور امام حمزہ رحمہ اللہ، امام کسائی رحمہ اللہ اور امام خلف رحمہ اللہ نے نون کی فتح (زبر) اور شین ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ چاروں قراءات بطریق تواتر نقل ہوئی ہیں اور قطعی الثبوت ہیں۔ [1]

3۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ﴾ (التوبۃ: 114) کا تعلق ہے۔ تو اس آیت میں جو قراءۃ تواتر سے ثابت ہے، وہ ہمزہ کے کسرہ (زیر) اور یاء مشددہ کے ساتھ ہے۔ اور اگر بعض نے اسے ہمزہ کی فتح (زبر) اور باء مخففہ کے ساتھ (أبـاه) پڑھا ہے تو معنی کے اعتبار سے اگرچہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اور رسمِ مصحف میں بھی اس کی گنجائش موجود ہے، لیکن یہ شاذ قراءۃ ہے۔ ان ثقہ قراء میں سے کسی نے اسے روایت نہیں کیا جن کی قراءات پر امت نے اعتماد کا اظہار کیا اور انہیں قبول عام حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا یہ قراءۃ قابل التفات ہے نہ اس کی کوئی اہمیت ہے۔ اگر قراءات کا ماخذ رسم الخط ہوتا تو قراء اس قراءۃ کو کبھی نظر انداز نہ کرتے اور یہ ان کے ہاں لازماً قابل اعتماد ہوتی۔ قراءۃ کے ثقہ ائمہ کا اس قراءۃ کو مسترد کرنا، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ قراءات کا اصل سرچشمہ نقل وسند ہے اور رسم الخط کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

4۔ چوتھی مثال جو گولڈ زیہر نے اس سلسلہ میں پیش کی ہے، وہ سورۃ النساء کی آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا﴾ (النساء 94)

---

[1] رسم الخط کو قطعاً ان میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ ان کی پشت پر نقل تواتر موجود ہے۔

میں لفظ ﴿فَتَبَيَّنُوٓا﴾ ہے۔

امام حمزہ رحمہ اللہ، کسائی رحمہ اللہ اور خلف رحمہ اللہ نے اسے ﴿فَتَثَبَّتُوا﴾ پڑھا ہے، جبکہ دیگر قراء نے "فَتَبَيَّنُوا" پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں قراءات صحیح اور تواتر سے ثابت ہیں۔ اور گولڈ زیہر نے سچ کہا، کیونکہ جھوٹا بھی کبھی سچ بول دیتا ہے، کہ "فتبینوا" کے رسم میں دو وجوہ کا احتمال ہے، لیکن قراءت میں اس قسم کے اختلافات سے فقہی اور معنوی اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔"

5۔ نہایت تعجب خیز بات جو گولڈ زیہر نے کہی ہے، وہ صفحہ 10 پر سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ (البقرۃ: 54) کے حوالے سے ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"قرآن کا یہ بیان درحقیقت تورات، سفر الخروج، فصل 32، فصلہ 27 کا چربہ ہے، جو قرآنی الفاظ کا اصل مصدر ہے۔"

گولڈ زیہر کی یہ بات جہاں ذات الٰہی پر واضح بہتان اور قرآن کے خلاف شر انگیزی ہے، وہاں یہ گولڈ زیہر کی تضاد بیانی کا مظہر بھی ہے، کیونکہ اس نے خود اپنی کتاب کے صفحہ 6 پر قرآن کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قرآن کے ہر کلمہ اور ہر حرف نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو محفوظ کرلیا ہے، جس کا قابل اعتماد متن ہمیشہ سے لوح محفوظ میں درج ہے۔ جہاں سے اسے فرشتہ، وحی کے ذریعے براہ راست رسول مختار پر نازل کیا گیا تھا۔ نیز مسلم اور غیر مسلم علماء اس حقیقت پر متفق ہیں کہ تمام آسمانی کتابوں کا ماخذ اور سرچشمہ لوح محفوظ ہے اور اس لحاظ سے قرآن کریم اور دیگر کتب سماویہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

اس کھلے اعتراف حقیقت کے باوجود گولڈ زیہر کا قرآن کریم کو تورات کا چربہ اور اختلاف قراءات کو نقل وتواتر کی بجائے محض قراء کی ذاتی پسند وناپسند کا نتیجہ قرار دینا محض ضد

اور ہٹ دھرمی ہے۔

گولڈ زیہر سورۃ البقرۃ کی مذکورہ بالا آیت:54 کے ضمن میں مزید لکھتا ہے:

''قدیم مفسرین، جن میں قتادۃ بصری (متوفی 117ھ) بھی شامل ہیں، نے سوچا کہ یہاں اس معاملہ میں ایک دوسرے کو قتل کرنا یا ان میں سے مجرموں کو قتل کرنا چونکہ سنگدلی ہے یا یہ سزا ان اسرائیلیوں کے جرم سے مطابقت نہیں رکھتی تو انہوں ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کی بجائے اوپر کے دو نقطوں کو نیچے منتقل کر کے "فأقيلوا أنفسكم" پڑھا دیا۔ جس کا معنی یہ ہے کہ اپنے جرم پر ندامت کے ساتھ توبہ کرو۔ گزشتہ مثالوں کے برعکس جن میں اختلاف قراءت کا اصل سبب رسم سے متعلق بعض فنی الجھاؤ ہیں، یہ مثال فی الواقع اس بات کی دلیل ہے کہ پیش نظر خیالات نے بھی اختلاف قراءت میں کردار ادا کیا ہے۔''

گولڈ زیہر کی رائے کا تجزیہ:

گزشتہ صفحات میں ہم قطعی دلائل سے یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ قراءات قرآنیہ کا اصل سرچشمہ نقل تواتر ہے جو بغیر کسی تعطل کے نسل در نسل ہم تک پہنچی ہیں اور مستند قراءات کے اس پورے سلسلے میں رائے اور اجتہاد کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ قراءات قرآنیہ دور ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دور عثمان رضی اللہ عنہ میں تدوین قرآن سے پہلے بھی موجود تھیں، لہٰذا مصاحف عثمانیہ کا رسم، ان کی ہیئت و ترکیب اور ان کا نقطوں اور حرکات سے خالی ہونا، اختلاف قراءات کا باعث یقیناً نہیں ہے۔

اور جہاں تک تعلق ہے گولڈ زیہر کی طرف سے پیش کردہ امام قتادۃ رحمہ اللہ کی طرف منسوب قراءۃ "فأقيلوا أنفسكم" کا، تو حقیقت یہ ہے کہ ثقہ اور ماہرین فن قراء میں سے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ نہ اس کی کوئی سند ہے کہ جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ قراءۃ سراسر بے بنیاد اور خود ساختہ ہے۔ نیز امام قتادۃ بصری رحمہ اللہ کسی سلسلہ قراءت کے ساتھ منسلک نہیں ہیں۔ سوائے اس ایک قراءۃ کے کوئی قراءت ان کی طرف منسوب ہے، نہ اس

قراءت میں ان کے ساتھ کوئی دوسرا شریک ہے۔

اس قراءۃ کے خود ساختہ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ خود امام قتادۃ رحمہ اللہ سے اس آیت کی جو تفسیر منقول ہے، وہ اس قراءۃ کے خلاف ہے۔ چنانچہ شیخ المفسرین امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں امام قتادۃ رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے:

((قاموا صفین یقتل بعضهم بعضا ، حتی قیل لهم کُفّوا .))

''وہ قطار میں کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے یہاں تک کہ انہیں رکنے کا حکم ملا۔''

امام قتادۃ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حکم الٰہی کی تعمیل کے بموجب مقتول شہید قرار پائے اور زندوں کی توبہ قبول ہوئی۔ چنانچہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

''قوم بنی اسرائیل کو نہایت سخت حکم ملا، وہ اٹھے اور تیز دھار آلوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ اور جب ان کی سزا پوری ہوئی تو تیز دھار آلے ان کے ہاتھ سے گر گئے اور قتل کا سلسلہ رک گیا۔ جو زندہ بچ گئے، ان کی توبہ قبول ہوئی اور جو قتل ہو گئے، شہید قرار پائے۔''

ان دونوں تفسیری بیانات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام قتادۃ رحمہ اللہ کے نزدیک اس آیت کریمہ میں قتل سے مراد حقیقی معنوں میں قتل ہے۔ اور تاریخ کے ہر دور میں جمہور مفسرین کا بھی یہی موقف رہا ہے۔ جب امام قتادۃ رحمہ اللہ کا اپنا نقطہ نظر ہی ان کی طرف منسوب قراءۃ کے خلاف ہے تو بلاخوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ قراءۃ امام قتادۃ رحمہ اللہ کی ذات پر بہتان ہے۔ اگر یہ قراءۃ ان سے ثابت ہوتی تو اس آیت کی تفسیر میں بھی ان کا موقف وہی ہوتا جو گولڈ زیہر نے نقل کیا ہے کہ قتل سے مراد اپنے جرم پر ندامت کا اظہار ہے۔ حالانکہ امام قتادۃ رحمہ اللہ سے واضح طور پر یہ ثابت ہے کہ قتل سے مراد یہاں حقیقی معنوں میں قتل ہے، جیسا کہ امام طبری رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ لہٰذا ان کی طرف اس قراءۃ کی نسبت کسی طور بھی صحیح قرار نہیں دی جا سکتی۔ الغرض، یہ ایک منکر اور

غیر معروف قراءۃ ہے جو امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ثابت نقل صحیح کے خلاف ہے، لہٰذا اس قراءۃ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

6۔ سورۃ الفتح کی آیت ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝﴾ کے بارے میں گولڈ زیہر کی گفتگو کا ماحاصل یہ ہے کہ

"﴿وَتُعَزِّرُوهُ﴾ میں (ہ) ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی مدد کرو۔ چونکہ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کے منافی تھا، اس لیے کہ وہ اپنے تمام بندوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ کسی مدد واعانت کا قطعاً محتاج نہیں، لہٰذا بعض لوگوں نے ﴿تُعَزِّرُوهُ﴾ کو بدل کر زاء کے ساتھ "تعززوه" پڑھ دیا، جس کا معنی یہ ہے کہ تم اس کی تعظیم کرو۔ اس لیے کہ یہ معنی اللہ کی شان کے مطابق ہے۔"

پھر گولڈ زیہر کو احساس ہوا کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن میں بندوں کی طرف سے اللہ کی مدد و نصرت کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ﴾ (الحج: 40)، ﴿إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ﴾ (محمد: 7) اور ﴿وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (الحشر: 8) تو اس نے مذکورہ تینوں آیات کا یہ جواب دیا کہ لفظ "نصر" اگرچہ مدد و مساعدت کا ہم معنی ہے، لیکن بعض دفعہ یہ ظاہری اور مالی مدد کے بجائے نصرتِ ادبی، یعنی اطاعت و فرمانبرداری کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ لفظ "عزر" یہاں ظاہری اور مالی مدد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ انتہی

گولڈ زیہر کی رائے کا تجزیہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ آیت کریمہ کے تینوں الفاظ "تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ" میں "ہ" ضمیر کے مرجع کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کی رائے میں پہلے دو الفاظ "تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ" میں ضمیر کا مرجع "ورسوله" یعنی رسول

اللہ کی ذات گرامی ہے، کیونکہ آیت مبارکہ میں قریب ترین مرجع یہی ہے۔ اس کی تائید سورۃ الاعراف کی آیت ﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ﴾ سے بھی ہوتی ہے۔ یہاں "وَعَزَّرُوهُ" میں "ہ" ضمیر کا مرجع بالاتفاق رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ قرآن کریم کا بعض حصہ بعض کی تفسیر کرتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں آیات میں رسول اللہ ﷺ کی تعزیر (امداد) سے مراد دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے آپ ﷺ کے ساتھ مالی اعانت ومساعدت ہے۔ اور آپ ﷺ کی طرف امداد واعانت کی نسبت میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ اور "وَتُسَبِّحُوهُ" میں ضمیر کا مرجع لازمی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، کیونکہ تسبیح اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں ہے۔

جبکہ مفسرین کے دوسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ ان تینوں الفاظ میں "ہ" ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات عالی ہے، کیونکہ اصول یہ ہے کہ اگر متعدد ضمائر ایک ہی سلسلہ میں ترتیب کے ساتھ واقع ہوں تو ان کا مرجع بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ اور یہاں اللہ کی تعزیر (امداد) سے مراد اس کے دین اور شریعت کو تقویت دینا ہے۔ ثابت ہوا کہ "تُعَزِّرُوهُ" کا مفہوم قطعاً ذات الٰہی کی شان کے منافی نہیں ہے۔

باقی جہاں تک زاء کے ساتھ قراءت کا تعلق ہے تو ائمہ عشرہ تو درکنار قراءات شاذہ کے قراء میں سے بھی کسی نے اس قراءت کو جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ یہ کسی بھی مستند روایت سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس کا معنی صحیح ہے اور رسم مصحف میں بھی اس کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے باوجود امت مسلمہ نے اسے قراءت کے طور پر قبول نہیں کیا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قراءات قرآنیہ کا باعث رسم مصحف قطعاً نہیں ہے، بلکہ قراءات کا تمام تر انحصار نقل صحیح اور سند سلیم پر ہے۔

اب ہم ان قراءات کا جائزہ لیں گے، جن کا باعث گولڈ زیہر کے خیال میں مصحف کا حرکات سے خالی ہونا ہے:

1۔ اس سلسلہ کی پہلی قراءۃ جو گولڈ زیہر نے ذکر کی ہے، وہ ہے: ﴿مَا تُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ

إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ﴾ (الحجر: 8)

یہاں لفظ "تُنَزِّلُ" میں گولڈ زیہر نے تین قراءات کا ذکر کیا ہے:

1۔ پہلے نون کی پیش اور دوسرے نون کی زبر اور زاء کی شد اور زیر کے ساتھ "تُنَزِّلُ" اور
2۔ تاء کی زبر، اس کے بعد نون ساکن اور زاء کی زیر کے ساتھ "تَنْزِلُ" اور
3۔ تاء کی پیش، اس کے بعد نون ساکن اور زاء کی زبر کے ساتھ "تُنْزَلُ"۔

گولڈ زیہر کی رائے کا تجزیہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مصحف کے رسم میں مذکورہ تینوں قراءات کی گنجائش موجود ہے، لیکن اس لفظ میں جو قراءات تواتر سے ثابت ہیں، وہ صرف تین قراءات ہیں۔ پہلی وہی جس کا گولڈ زیہر نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ امام حفص، امام حمزہ، کسائی اور امام خلف کی قراءۃ ہے۔ دوسری قراءۃ، تاء کی پیش، نون کی زبر اور زاء کی زبر اور شد کے ساتھ "تُنَزَّلُ"، یہ امام عاصم رحمہ اللہ کوفی کی قراءۃ ہے۔ اور تیسری قراءۃ، تاء اور نون کی زبر اور زاء کی زبر اور شد کے ساتھ "تَنَزَّلُ" یہ امام نافع، ابوجعفر مدنی، ابن کثیر مکی، ابوعمرو بصری، یعقوب بصری اور ابن عامر شامی رحمہم اللہ کی قراءۃ ہے۔

دیگر دو قراءات جو گولڈ زیہر نے ذکر کی ہیں، وہ قراءات متواترہ یا صحیحہ یا شاذہ تو درکنار، یہ بھی معلوم نہیں کہ کسی قاری نے انہیں پڑھا ہو۔ بلکہ یہ گولڈ زیہر کی خود ساختہ ہیں اور اس لائق ہیں کہ انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اس سے جہاں گولڈ زیہر کی دیدہ دلیری کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ قراءات قرآنیہ کے اتفاق واختلاف میں مصحف کے نقطوں اور اعراب سے خالی ہونے کا قطعاً کوئی کردار نہیں ہے۔ اس حقیقت کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سورۃ الحجر کی مذکورہ آیت میں تو قراء کا اختلاف ہے، لیکن اسی سورت کی آیت 21: ﴿وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ﴾ میں قراءت کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تمام قراء نے بالاتفاق اسے پہلے نون کی پیش اور دوسرے نون کی زبر اور زاء مشددہ کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔

2۔ دوسری مثال جو گولڈ زیہر نے پیش کی ہے، وہ سورۃ الرعد کی آیت ﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾ ہے۔

قرائے عشرۃ نے اسے میم کی زبر کے ساتھ "وَمَنْ" پڑھا ہے۔ اور دال کی زبر کے ساتھ "عِندَهُ" پڑھا ہے اور "عِلْمُ الْكِتَابِ" کو عین کی زیر اور لام ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ ترکیب یوں ہوئی: "مَنْ" اسم موصول لفظ اللہ پر معطوف ہے۔ اور "عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ" خبر مقدم اور مبتدا مؤخر ہو کر جملہ اسمیہ ہوا اور یہ جملہ "من" صلہ کے لیے موصول ہوا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ ہی کافی ہے اور یہود و نصاریٰ میں سے وہ بھی کہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے گواہ ہونے کے اعتبار سے، اس بات پر کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں۔

اور حسن بصری رحمہ اللہ اور مطوعی رحمہ اللہ نے "وَمَنْ" کو میم کی زیر کے ساتھ "وَمِنْ" اور "عندہ" کو دال اور "ھا" کی زیر کے ساتھ "عِندِهِ" پڑھا ہے۔ ترکیب یوں ہوگی کہ "مِنْ" حرف جار، جار مجرور مل کر خبر مقدم اور علم الکتاب، مضاف و مضاف الیہ مل کر مبتدا مؤخر ہوا۔ لیکن یہ قراءۃ عدم تواتر کی وجہ سے شاذ ہے۔ اور قراءۃ شاذہ قطعاً ناقابل اعتبار ہے۔ گولڈ زیہر کا اسے قراءۃ کے طور پر پیش کرنا سراسر بددیانتی ہے۔ امت مسلمہ نے آج تک اسے قرآن تسلیم نہیں کیا۔ کوئی بھی قراءۃ اس وقت تک قرآن قرار نہیں پا سکتی جب تک وہ تواتر سے ثابت نہ ہو۔ یہ اس حقیقت کا واضح اور کافی ثبوت ہے کہ قراءات کا سرچشمہ اور ماخذ سوائے نقل و روایت کے کچھ نہیں ہے۔ رسم و کتابت کا قراءات کے وجود میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

نیز "عُلِمَ" کو بطور فعل عین کی پیش اور لام کی زیر اور "الْكِتَابُ" کو نائب فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع بھی پڑھا گیا ہے۔ لیکن یہ قراءۃ گزشتہ قراءۃ سے بھی کہیں زیادہ شاذ ہے۔ اسی طرح (عُلِّم) میں لام کی شد کے ساتھ بھی ایک قراءۃ ہے، لیکن یہ گزشتہ دونوں سے بھی زیادہ شاذ ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسم مصحف میں مذکورہ تمام قراءات کی گنجائش موجود

ہے، لیکن سوائے پہلی قراءۃ کے ان میں سے کوئی بھی قراءۃ درست نہیں ہے۔ اس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قراءات کا اصل سرچشمہ نقل و روایت ہے، رسم و کتابت قطعاً نہیں ہے۔ قراءات قرآنیہ کا مرکز و محور ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہر دور میں ایک نسل اسے براہ راست سن کر آئندہ نسل تک منتقل کرتی رہی ہے۔

گولڈ زیہر کی طرف سے
قراءات میں تضاد و تناقض کا دعویٰ اور اس کی حقیقت

گولڈ زیہر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ بعض قراءات میں اس طرح کا تناقض اور معنوی تعارض موجود ہے کہ ان کے درمیان تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس کے بعد اس نے سورۃ الروم کی ان ابتدائی آیات کو بطور دلیل پیش کیا ہے:

﴿الٓمٓ ○ غُلِبَتِ الرُّومُ ○ فِیٓ أَدْنَی الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ ○﴾ (الروم: 1-3)

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ

''بعض دفعہ ایک ہی قراءۃ ایک مفہوم کی نفی اور اس کے متضاد معنی کو ثابت کر رہی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ایک تاریخی واقعہ سورۃ الروم کے آغاز میں ذکر ہوا ہے۔''

اس کے بعد گولڈ زیہر نے مذکورہ آیات اور مفسرین کے نزدیک ان کی تفسیر کا تذکرہ کیا ہے کہ اس میں دراصل مشرکین مکہ کی تردید ہے کہ 616ء میں جب انہیں اہل فارس کی رومیوں کے خلاف فتح کا علم ہوا تو وہ رومیوں کی شکست پر بڑے خوش ہوئے، کیونکہ بت پرست ہونے کی وجہ سے ان کی طبعی ہمدردیاں اہل فارس کے ساتھ تھیں۔ لیکن اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی ہمدردیاں فطری طور پر رومیوں کے ساتھ تھیں، کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ چنانچہ ان آیات میں اہل مکہ کے سامنے پیش گوئی کی گئی ہے کہ عنقریب صورت حال الٹ جائے گی اور کچھ عرصہ بعد اہل روم فتح یاب ہوں گے۔ مسلمان اس کو نبی ﷺ کی

نبوت کی دلیل سمجھتے ہیں، کیونکہ نبی ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق ہرقل واقعی 625ء میں فارس پر غالب آ گیا تھا۔ اگرچہ اس قسم کے تاریخی واقعات کا احاطہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

گولڈ زیہر مزید لکھتا ہے:

''ہمارے خیال میں یہاں مسئلہ کو امید کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ رومی اب مغلوب ہوئے ہیں، امید ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ فتح سے ہمکنار ہوں گے۔ لیکن آیت کی یہ قراءۃ تمام قراء کے ہاں متفقہ نہیں ہے، بلکہ اکثر قراء نے اسے ﴿غَلَبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيُغْلَبُونَ﴾ پڑھا ہے۔ یعنی "غلبت" کو فعل معروف کے ساتھ اور "سیغلبون" کو فعل مجہول کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا تعلق رومیوں کی اس فتح کے ساتھ ہے جو شام کی سرحدوں پر انہیں بعض عرب قبائل کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔ ہمارے (گولڈ زیہر) خیال میں یہ دونوں قراءات معنوی اعتبار سے باہم متعارض ہیں، کیونکہ مشہور قراءۃ میں فتح سے ہمکنار ہونے والے دوسری قراءۃ میں شکست سے دوچار ہو رہے ہیں۔'' [1]

اور ڈاکٹر عبد الحلیم النجار کے ترجمہ کے مطابق گولڈ زیہر کہتا ہے:

''لیکن تمام قراء اس متن کی قراءت پر متفق نہیں ہیں، جیسا کہ گزر چکا ہے۔ بلکہ انہوں نے ("غُلِبَتِ" کی بجائے) صیغہ معروف کی بناء پر اسے "غَلَبَتِ الرُّومُ" بھی پڑھا ہے۔ اس میں اہل روم کی اس فتح کی طرف اشارہ ہے جو انہیں شام کی سرحدوں پر آباد عرب قبائل کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔ اور ﴿فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ﴾ اور بصیغہ مجہول ﴿سَيُغْلَبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ﴾ کی قراءۃ کو جو مسلمان جائز سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اس میں اس فتح کی خبر دی گئی ہے جو وحی کے نو سال بعد نوخیز

[1] المذاهب الاسلامیه، ترجمه از ڈاکٹر علی حسن عبد القادر۔

امت مسلمہ کو بازنطینی حکومت کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔ اور ہمارے خیال میں مشہور قراءۃ اور اس کی مخالف قراءۃ میں بہت زیادہ معنوی تضاد ہے۔ مشہور قراءۃ میں فتح سے ہمکنار ہونے والے دوسری قراءۃ میں شکست سے دو چار ہو رہے ہیں۔ پہلی صورت میں فعل کا جو صیغہ معروف استعمال ہوا ہے، دوسری صورت میں وہی صیغہ مجہول استعمال ہو رہا ہے، لہٰذا کلام اللہ کے ایک ہی جملہ کی یہ دو مختلف قراءاتیں اور دو مختلف معانی باہم متناقض اور متضاد ہیں۔'' ❶

گولڈ زیہر کا یہ اقتباس دو نکات پر مبنی ہے:

1۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے رومیوں کے غلبہ کی خبر وثوق اور یقین کی بجائے امید اور تجزیہ کے پیرائے میں دی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت مستقبل کی کسی پیش گوئی پر مبنی نہیں ہے، لہٰذا اسے نہ تو سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کی صداقت کی واضح دلیل قرار دیا سکتا ہے اور نہ ہی اس بنیاد پر قرآن کو کلام الٰہی مانا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص جو چاہے آرزو کر سکتا ہے اور آزاد مرضی سے حالات کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی پابندی نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو خواہش کی حد تک ہی محدود رکھے اور کسی امر محال کی آرزو نہ کرے۔

2۔ دونوں قراءات کے درمیان واضح تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ دوسری قراءۃ نے پہلی قراءۃ میں فتح یاب ہونے والوں کو شکست سے دو چار قرار دے دیا ہے۔ اور یہ واضح تناقض ہے۔

گولڈ زیہر کی پہلی بات کا جائزہ:

جہاں تک گولڈ زیہر کی پہلی بات کا تعلق ہے تو وہ سراسر باطل اور بے بنیاد ہے، کیونکہ اس پوری آیت مبارکہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے امید، تمنا یا آرزو کا مفہوم کشید کیا جا سکے۔ بلکہ آیت کے الفاظ میں معمولی سا غور وفکر یہ واضح کرنے کے کافی ہے کہ یہاں

❶ مذاهب التفسير الاسلامی، ص 30 _ 31

مستقبل میں پیش آنے والے ایک واقعہ کی انتہائی یقین اور پورے وثوق واعتماد سے خبر دی جا رہی ہے کہ یہ واقعہ عنقریب وحی الٰہی کے مطابق یقیناً رونما ہونے والا ہے۔اور اس کے لیے باقاعدہ مدت کا تعین بھی کر دیا گیا ہے کہ اس دوران رومی اہل فارس پر غالب آ ئیں گے۔ وقت کا تعین اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ خبر دینے والے کو اپنی خبر کی صداقت کا پورا یقین ہے۔کوئی بھی ذی شعور انسان محض اپنی آرزو اور خواہش کے پورا ہونے کے لیے زمانہ اور مدت کے تعین کی غلطی نہیں کرتا۔خصوصاً ان حالات میں جبکہ اس خبر کے پورا ہونے کا دور دور تک امکان نہ ہو۔تو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک ایسے واقعہ کی پیش گوئی جس کے پورا ہونے کا اس وقت کوئی امکان نہیں تھا، اور پھر اس پیش گوئی کو مکمل اعتماد و یقین کے ساتھ پیش کرنا، نیز اس کے لیے باقاعدہ مدت کا تعین کیا جانا، اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ یہ خبر قطعاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی اور نبی ﷺ کی حیثیت بس ایک مخبر کی ہے جو اپنی خواہش سے نہیں بولتے، بلکہ اللہ کے پیغام کو انسانیت تک پہنچاتے ہیں۔

اس پیش گوئی میں دو امور کی خبر دی گئی ہے۔ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا اور دوسرا یہ کہ یہ غلبہ کتنے عرصہ میں پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔کوئی بھی ذی شعور انسان محض ذاتی گمان کی بنیاد پر ایسی پیش گوئی نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ اس وقت رومی سلطنت اپنے زوال کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی اور اس کے ثبوت کے لیے اتنا کافی ہے کہ جنگ کی آگ اس کے گھر کے صحن تک پہنچ گئی تھی اور پوری مملکت شکست و ریخت سے دوچار ہو چکی تھی ،جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فِي أَدْنَى الْأَرْضِ﴾ کہ ”قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں۔“ ان حالات میں کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ رومی سلطنت اپنا وجود بھی برقرار رکھ سکے گی، چہ جائیکہ اس کی فتح اور غلبہ کا متعین وقت بتلا دیا جائے۔یہی وجہ تھی کہ جب قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں تو کفار مکہ نے ان کا خوب مذاق اُڑایا اور اس پیش گوئی کو جھٹلا دیا، بلکہ انہوں نے شرط بدنے کی پیش کش کی۔ جس پر بالآخر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ابی بن خلف کے درمیان یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط

ثابت ہوگی وہ سو اونٹ دے گا، کیونکہ قرآن کریم نے ایک تیسری پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ یہی وہ دن ہوگا جب اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہل ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔ اس میں واضح اعلان تھا کہ جس دن رومیوں کو ایرانیوں پر غلبہ نصیب ہوگا، مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں اہل مکہ پر فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر جب ان دونوں فتوحات کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ ان حالات میں کوئی یہ تصور آخر کیسے کر سکتا تھا کہ ان دونوں فتوحات کی یہ پیش گوئی ایک ہی دن میں پوری ہوگی؟ اس لیے قرآن کریم نے اس پیش گوئی کو ذکر کرنے کے فوراً بعد پورے زور کے ساتھ کہا: ﴿وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥﴾ ''یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے، اللہ کبھی اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

اور تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ سات سال کے دوران رومی مکمل طور ایرانیوں پر غالب آ گئے تھے۔ اللہ کی قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور امام طبرانی رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ دونوں پیش گوئیاں مقررہ مدت کے اندر اندر بیک وقت پوری ہو گئیں۔ اس طرح اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سچ ثابت ہوئی۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ سالوں کا تعین کرنے کی بجائے لفظ "بضع" کیوں استعمال کیا کہ جس کا اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو فتح کا دن، وقت اور سال معلوم نہیں تھا؟

<u>جواب</u>: دنیا میں سالوں کی گنتی کے لیے مختلف طریقے رائج ہیں۔ بعض کے ہاں شمسی کیلنڈر رائج ہے تو بعض کے ہاں قمری کیلنڈر۔ تو حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو حساب کے ان تمام رائج طریقوں کو شامل ہو۔ اور کسی قسم کا شبہ اور اختلاف باقی نہ رہے۔ بعض دفعہ فتح کی پیش گوئی اور اس کے لیے فیصلہ کن واقعات کے

درمیان معاملہ التوا کا متقاضی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ریاضی دانوں کے درمیان اس وقت کی تعیین میں اختلاف ہو جاتا ہے، جس میں فتح کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ لہذا "بعد بضع" کے بجائے "فی بضع" کی تعبیر نہایت خوبصورت اور واقعہ کے اعتبار سے نہایت موزوں ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیت مبارکہ میں مستقبل کے ایک واقعہ کی پیش گوئی کی گئی ہے، جس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے پاس نہیں تھا۔ اور یہ خبر اس حقیقت کا قطعی ثبوت ہے کہ محمد کریم ﷺ کی نبوت برحق اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

گولڈ زیہر کی یہ بات کہ دونوں قراءات کے درمیان واضح تضاد پایا جاتا ہے، تو عرض یہ ہے کہ آیت کریمہ میں دو قراءات ہیں: پہلی قراءۃ: "غُلِبَت" غین کی پیش اور لام کی زیر کے ساتھ اور "سَیَغلِبُونَ" یاء کی زبر اور لام کی زیر کے ساتھ ہے۔ یہ متواتر قراءۃ ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ رومیوں کو قریب کی سرزمین میں شکست ہوئی ہے۔ یعنی وہ سرزمین جو مکہ مکرمہ کی حدود کے قریب ہے۔ یہ جگہ اذرعات اور بصریٰ کے درمیان واقع ہے اور بلاد شام کا مکہ سے قریب ترین علاقہ یہی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ جگہ الجزیرہ میں ہے، اس لحاظ سے یہ جگہ عجم میں ارض کسریٰ کے زیادہ قریب ہے۔ بعض کے نزدیک اردن اور فلسطین میں ہے۔ اس لحاظ سے یہ جگہ بلاد روم کے زیادہ قریب ہے۔ ﴿وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ "اہل روم ایرانیوں سے شکست کھانے کے بعد عنقریب چند سالوں میں ایرانیوں کو شکست سے دوچار کریں گے۔" اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب رومیوں نے ایرانیوں کو شکست فاش دی اور رومیوں کے زیر قبضہ عرب علاقوں پر بھی قابض ہو گئے تو یہی وہ دور تھا جب مکہ میں مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان سرد جنگ جاری تھی۔ رومی اہل کتاب اور دین نصرانیت کے پیروکار تھے، اس لیے اصولی طور پر مسلمانوں کی ہمدردیاں مسیحیوں کے ساتھ تھیں اور ان پر ایرانی مشرکوں کا غلبہ انہیں ناگوار تھا۔ اور ایرانی توحید کے

منکر، دین مجوسیت کے پیروکار اور آتش پرست تھے، اس لیے مشرکین مکہ قدرتی طور ان آتش پرستوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ تو جب روم پر ایران کے غلبہ کا چرچا عام ہوا تو مشرکین مکہ اس پر بغلیں بجاتے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے: دیکھو! جس طرح ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کو ماننے والے عیسائی شکست کھا رہے ہیں، اس طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمہارا اور تمہارے دین کا خاتمہ کریں گے۔ ان حالات میں کہ جب مسلمان رومیوں کی شکست اور مشرکین کے طعنوں سے دل گرفتہ تھے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہ خوش خبری دی گئی کہ چند سال کے عرصے میں نہ صرف رومی اہل کتاب، ایرانی بت پرستوں پر فتح پائیں گے بلکہ اسی دوران مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح حاصل ہوگی اور وہ اس پر خوش ہو رہے ہوں گے۔ آیت کے تناظر میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آیت کا شان نزول اور اس کا مفہوم قراءۃ متواترہ کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور ان کے درمیان ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ یہ تھا پہلی قراءت کا مفہوم اور اس کا پس منظر۔

اس آیت میں دوسری قراءۃ: "غَلَبَتْ" غین اور لام کی زبر کے ساتھ اور "سَيُغْلَبُونَ" یاء کی پیش اور لام کی زبر کے ساتھ ہے۔ اس کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات کی طرف کی گئی ہے۔ اس قراءۃ کی بنیاد پر مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہوگی اور اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ رومی قریب کی سرزمین، شام کے علاقوں میں غالب آگئے ہیں۔ اور عنقریب چند سالوں میں مسلمان رومیوں پر غالب آجائیں گے۔ پھر واقعی نو ہجری میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے انہیں شکست دیتے ہوئے ان کے بعض علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اس قراءۃ کی بنیاد پر آیت کا مذکورہ مفہوم متواتر قراءۃ کے مفہوم سے متناقض نہیں ہے۔ قراءۃ متواترہ یہ بتاتی ہے کہ پہلے ایرانی، رومیوں پر غالب آئیں گے۔ اور پھر چند سالوں میں رومی ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔ بعد میں تاریخ نے اسے سچ ثابت کر دیا۔ اور دوسری قراءۃ یہ بتا رہی ہے کہ رومیوں نے شامی علاقوں پر تسلط قائم کرلیا ہے اور بیت المقدس کو ایرانیوں کے تسلط سے آزاد کروا کر اس پر اپنی

حکمرانی قائم کر لی ہے، لیکن یہ حکمرانی اور فتح زیادہ دیر نہیں بلکہ چند سال ہی قائم رہ سکے گی۔ پھر مسلمان رومیوں سے جنگ کریں گے اور انہیں شکست دے کر بالآخر ان کے زیر قبضہ بیت المقدس اور دیگر شامی علاقوں پر اپنی حکومت قائم کریں گے۔ تو اس دوسری قراءۃ کا یہ معنی قراءۃ متواترہ کے مفہوم سے متناقض نہیں ہے۔ تضاد اور تناقض اس وقت ثابت ہوتا ہے جب ایک ہی معاملے اور ایک ہی دور میں دو متضاد چیزیں سامنے آئیں۔ مثلاً کوئی کہے کہ اصغر نے فلاں دن سلمان کو شکست دی تھی۔ اور ساتھ ہی کہے کہ سلمان نے اصغر کو اسی وقت شکست دی تھی جس وقت اصغر نے اسے شکست دی تھی تو یہ واضح تضاد ہے۔ لیکن اگر دو متضاد چیزیں دو مختلف معاملات میں سامنے آتی ہیں تو پھر کوئی تضاد نہیں ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ فلاں شخص نے فلاں شخص کو تو شکست دی، لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرے شخص سے شکست کھائی۔ اسی طرح اگر ایک ہی معاملے میں دو متضاد چیزیں سامنے آتی ہیں، لیکن مختلف ادوار میں، تو اس میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔ مثلاً کوئی کہے کہ فلاں شخص نے فلاں کو فلاں وقت میں شکست دی اور اسی سے کسی دوسرے وقت میں شکست کھائی۔ تو اسی طرح ان دو قراءات میں دو مختلف واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس میں تضاد کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

پوری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ ایرانیوں نے قریب کی سرزمین میں رومیوں کو شکست دی ہے، لیکن چند سال بعد رومیوں کو ایرانیوں پر فتح نصیب ہوگی۔ یہ مطلب ہے پہلی قراءۃ کا جو کہ متواتر قراءۃ ہے۔ اور یہ کہ رومیوں نے قریب کی سرزمین میں ایرانیوں کو شکست دی ہے، لیکن چند سال کے بعد مسلمانوں کو رومیوں پر فتح نصیب ہوگی، یہ مطلب ہے دوسری قراءۃ کا، اور دونوں قراءات کے مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ علمائے مفسرین کی تفسیر کا خلاصہ ہے جو انہوں نے ان دو قراءات کے درمیان تطبیق کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ گولڈ زیہر نے ان دو قراءات کے درمیان بڑی شد و مد سے تضاد کا دعویٰ کیا ہے، لیکن پھر خود اپنے ہی الفاظ سے اس کی تردید بھی کر دی ہے۔ چنانچہ اس نے ان دونوں قراءات کے مفہوم میں تطبیق دیتے

ہوئے اپنی کتاب کے صفحہ 31 پر لکھا ہے:

''(غُلِبَتِ کی بجائے) بصیغہ معروف "غَلَبَتِ الرُّومُ" بھی پڑھا گیا ہے۔اس میں اہل روم کی اس فتح کی طرف اشارہ ہے جو انہیں شام کی سرحدوں پر آباد عرب قبائل کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔اور "وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ" اور بصیغہ مجہول "سَيُغْلَبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ" کی قراءۃ کو جو مسلمان جائز سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اس میں اس فتح کی خبر دی گئی ہے جو وحی کے نو سال بعد نو خیز امت مسلمہ کو بازنطینی حکومت کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی۔''

اس صریح اقرار کے باوجود گولڈ زیہر کا دعوائے تضاد بذات خود تضاد کی واضح مثال ہے۔

گزشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو چکی کہ دونوں قراءات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ دوسری قراءۃ درج ذیل دو وجہ سے قطعاً قابل اعتناء نہیں ہے:

1۔ نہ تو یہ ائمہ عشرۃ کی قراءات میں سے ہے، جنہیں علمائے قراءت کے ہاں تواتر اور قبول عام کا مقام حاصل ہے اور نہ ہی یہ چار معروف قراءات شاذہ میں سے ہے۔

2۔ یہ قراءت نہ صرف آیت کے شان نزول اور صحیح تاریخی حقائق کے خلاف ہے بلکہ ان بے شمار احادیث و آثار سے بھی لگا نہیں کھاتی کہ جن کا ان آیات سے گہرا تعلق ہے،لہٰذا یہ قراءت اس قابل ہے کہ اسے مسترد کر دیا جائے۔

قراءات کے متعلق گولڈ زیہر کے دیگر خیالات کا تجزیہ:

مذکورہ عنوان کے تحت گولڈ زیہر نے یہ لکھا ہے:

''قراءات کے بعض اختلافات کا ایک سبب یہ خدشہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں وہ بیانات نقل نہ ہو جائیں جو ان کی شان کے منافی ہوں یا بعض شخصیات کی قدر و منزلت کے منافی ہوں۔تو اس خطرہ کے پیش نظر بعض قراء نے بعض کلمات میں اپنی طرف سے مناسب رد و بدل کر دیا، جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان، عظمت رسول اور بعض شخصیات کے احترام کے عین مطابق تھا۔''

اپنے اس دعویٰ کے حق میں گولڈ زیہر نے متعدد مثالوں کا سہارا لیا ہے، جنہیں ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

1۔ ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (آل عمران: 18)

اس کے ضمن میں گولڈ زیہر نے لکھا ہے:

"بعض قراء کو یہ تشویش ہوئی کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کے لیے گواہی کے متصل بعد یہ تذکرہ کہ فرشتے اور اہل علم بھی اللہ کے ساتھ یہ گواہی دیتے ہیں، مناسب نہیں۔ تو انہوں نے صیغۂ فعل کو جمع مکسر میں بدل دیا اور اس کا تعلق ماقبل آیت: ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْمُنْفِقِیْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ۝﴾ سے جوڑ دیا۔ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے گواہ ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور فرشتے بھی اس توحید پر اللہ کے گواہ ہیں۔ لیکن مذکورہ وجہ جواز کے موجدین نے سورۃ النساء کی آیت: ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ یَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَیْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ یَشْهَدُوْنَ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۝﴾ میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں کی، کیونکہ یہاں ترمیم مشکل تھی۔"

قارئین کرام! گولڈ زیہر کی یہ سخن سازی لائق توجہ ہے نہ اس قابل کہ اس کا رد کیا جائے، کیونکہ نزول قرآن کی تاریخ کے پہلے دن سے آج تک کسی قاری نے اس قراءۃ کو نہیں پڑھا اور معمولی علم وفہم کا حامل شخص بھی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے ذات کے لیے اپنے بندوں کے درمیان عدل کے قیام کی گواہی دینا کس طرح اس کے عظیم مقام الوہیت کے منافی بھی ہوسکتا ہے۔ اور مقام حیرت ہے کہ سورۃ النساء کا حوالہ دے کر گولڈ زیہر نے خود ہی اپنی رائے کا رد کر دیا ہے۔ جب گولڈ زیہر کو معلوم تھا کہ سورۃ النساء کی آیت بھی اسی مفہوم کو پیش کر رہی ہے جو سورۃ آل عمران میں بیان ہوا ہے تو بہتر تھا کہ وہ سورۃ آل عمران کی آیت کو تختۂ مشق نہ بناتا اور اس انتہائی درجے کی شاذ قراءۃ کو ذکر نہ کرتا۔

2۔ ﴿فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَّنْ خَلَقْنَا إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ ۝ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۝﴾ مشرکین مکہ کا خیال تھا کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی محال ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے اس نظریہ کی مذمت کرتے ہوئے اور امکان آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اپنے نبی ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ اگر یہ کائنات کی تخلیق میں غور فکر کریں گے تو انہیں آخرت کی حقیقت سمجھ آ جائے گی کہ جس خدا کے لیے یہ زمین و آسمان، ستارے و سیارے، فرشتے اور عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اس کے لیے تمہیں دوبارہ پیدا کرنا کیسے مشکل ہو گیا۔

گولڈ زیہر نے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ

"فرمان الٰہی: ﴿بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۝﴾ کے بارے میں قراء کا اختلاف ہے۔ عام قرائے کوفہ نے اسے تاء کی پیش کے ساتھ ﴿بَلْ عَجِبْتُ﴾ پڑھا ہے۔ قرائے مدینہ اور بصرہ نے بھی اسی طرح پڑھا ہے اور یہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءۃ ہے۔ لیکن بعض قرائے کوفہ نے اسے تاء کی زبر کے ساتھ ﴿بَلْ عَجِبْتَ﴾ پڑھا ہے۔ یہاں مفسرین نے اللہ تعالیٰ کی طرف تعجب و حیرانی کی نسبت کی مختلف تفاسیر بیان کی ہیں۔ لیکن دیگر نے تعجب کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء نے ذات الٰہی کی طرف تعجب و حیرانی کی نسبت کو مناسب خیال نہیں کیا، لہٰذا انہوں نے یہاں تاء کو زبر کے ساتھ پڑھ دیا۔ جس کا معنی یہ ہے کہ اے محمد آپ حیران ہیں اور یہ قرآن کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہاں ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ متکلم کا صیغہ "عَجِبْتُ" اصلی قراءۃ ہے۔"[1]

---

[1] حدیث مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے صفت تعجب کا استعمال ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ((ضَحِكَ رَبُّكُمْ مِنْ إِلِّكُمْ وَقُنُوطِكُمْ، وَعَجِبَ رَبُّكُمْ مِنْ شَابٍّ لَيْسَتْ لَهُ صَبْوَةٌ)) تو رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی موجودگی میں علماء کا اللہ تعالیٰ کی طرف تعجب کی نسبت کو نامناسب سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد گولڈ زیہر نے امام طبری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ دونوں قراءتیں قرائے امصار کے ہاں مشہور ہیں، دونوں اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے پڑھنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا یک کو دوسری پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ اس کے بعد گولڈ زیہر کہتا ہے کہ قاضی شریح رحمہ اللہ اسے تاء کی زبر کے ساتھ "عَجِبْتَ" پڑھتے تھے اور فرماتے تھے: ''اللہ تعالیٰ کسی چیز سے حیران نہیں ہوتا، وہ صرف لاعلم شخص پر حیران ہوتا ہے۔'' تو اس پر ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا کہ ''شریح رحمہ اللہ اپنے علم پر نازاں ہیں، لیکن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا علم ان سے زیادہ ہے اور وہ اسے پیش کے ساتھ پڑھتے تھے۔''

گولڈ زیہر کا سرمایہ تحقیق ختم ہوا، اب اس پر ہمارا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

- گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ ''عام قرائے مدینہ اور بصرہ اسے تاء کی پیش کے ساتھ "بَلْ عَجِبْتُ" پڑھتے ہیں'' محض جھوٹ اور افترا ہے۔ ابوجعفر، شیبہ بن نصاح، نافع بن ابونعیم رحمہ اللہ اور دیگر قرائے مدینہ اور ابوعمرو بصری، یعقوب رحمہ اللہ اور دیگر قرائے بصرہ نے اسے صرف فتح (زبر) کے ساتھ پڑھا ہے۔
- اور گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ ''علماء نے ذات الٰہی کی طرف تعجب وحیرانی کی نسبت کو مناسب خیال نہیں کیا، لہٰذا انہوں نے یہاں تاء کو زبر کے ساتھ پڑھ دیا۔'' بھی سراسر زیادتی ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم واضح دلائل سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ قراءات قرآنیہ میں رائے، اجتہاد اور ذاتی پسند وناپسند کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ قراءات کا تمام تر انحصار نقل اور روایت وسند پر ہے اور یہاں علماء نے ذات الٰہی کی طرف تعجب وحیرانی کی نسبت کی جو تفسیر وتاویل بیان کی ہے وہ اس کی شان الوہیت کے عین مطابق ہے۔ علمائے مفسرین نے اس کی تفسیر استعظام اور جزا وسزا وغیرہ سے کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ میں اسے اپنی قدرت کا عظیم کرشمہ سمجھتا ہوں، اس کے باوجود یہ میری آیات کا مذاق اڑا رہے ہیں تو انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ ان علماء کرام کے لیے بھلا کیسے ممکن تھا کہ وہ تاء کی پیش کے ساتھ قراءۃ جو تواتر سے ثابت ہے، کو محض اس

وجہ سے ترک کردیں کہ اس میں ذات الٰہی کی شان کے منافی مفہوم کا تاثر ابھرتا ہے۔
پھر ہم گولڈ زیہر سے پوچھتے ہیں کہ قراءات میں تبدیلی کا باعث اگر یہ خدشہ تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں، وہ فقرے نہ آجائیں جو اس کے شایان شان نہ ہوں تو پھر قرآن کریم میں موجود ان متعدد آیات میں تبدیلی کا خیال علماء کو کیوں نہ آیا کہ جن میں یہی خدشہ مذکورہ بالا آیت سے کہیں زیادہ ہے؟ یہ تمام آیات جو بظاہر اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان مشابہت پر دلالت کناں ہیں، ان میں تبدیلی کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی گئی۔ مثلاً یہ آیات ملاحظہ ہوں:

﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ (الفتح: 10)

﴿تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا﴾ (القمر: 14)

﴿وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ﴾ (الرحمن: 27)

﴿فَلَمَّا آسَفُونَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ (الزخرف: 55)

﴿وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا﴾ (النمل: 50)

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (البقرة: 222)

یہ تمام آیات بظاہر اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت کے منافی معلوم ہوتی ہیں، لیکن علماء نے بالاتفاق ایسی تمام آیات کی جو تفسیر وتعبیر کی ہے، وہ اللہ کی شان الوہیت کے بالکل مطابق ہے اور اس سے اللہ اور بندوں کے درمیان مشابہت کا تاثر ختم ہو جاتا ہے۔

※ اور گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ "یہاں ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ متکلم کا صیغہ "عَجِبْتُ" اصلی قراءۃ ہے۔" محض دھونس اور دھاندلی ہے۔ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ پیش کے ساتھ قراءت اصلی قراءۃ ہے؟ آخر کس بنیاد پر آپ نے یہ فرض کر لیا؟ جبکہ دونوں قراءات متواتر اور قطعی ویقینی ذرائع سے ثابت ہیں۔ دونوں مقام ومرتبہ میں برابر ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے ایک قراءۃ کو اصلی اور دوسری کو فرعی قرار دینا سراسر باطل ہے، کیونکہ اصول یہی ہے کہ دو ہم پلہ چیزوں کے درمیان بغیر کسی دلیل کے ترجیح باطل ہوتی

ہے۔سوال یہ ہے کہ تاء کی زبر والی قراءت کیوں اصلی نہیں ہو سکتی، جبکہ وہ گولڈ زیہر کے موہوم خدشہ سے مبرا ہے؟حقیقت یہ ہے کہ قراءات کے درمیان اصلی اور فرعی کا کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ مقررہ معیار کے اوپر پورا اترنے والی تمام قراءات روایت ونقل اور استنادی اعتبار سے برابر ہیں۔اس اعتبار سے کسی بھی قراءت کو کوئی امتیازی شان حاصل نہیں ہے۔اس حقیقت کی کی ایک بڑی دلیل امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا مذکورہ بالا قول ہے جسے خود گولڈ زیہر نے نقل کیا ہے۔باقی قاضی شریح رحمہ اللہ کا یہ قول کہ ''اللہ تعالیٰ کسی چیز پر حیران نہیں ہوتا، وہ صرف لاعلم شخص پر حیران ہوتا ہے۔'' اس کا زیادہ سے زیادہ یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ انہوں نے فتح (زبر) کی قراءۃ کو پیش کی قراءۃ پر ترجیح دی ہے، کیونکہ فتح کی قراءۃ میں کسی معنوی تاویل کی ضرورت پیش نہیں آتی، جبکہ پیش کی قراءۃ اپنے مفہوم میں تاویل وتشریح کی محتاج ہے۔اور ظاہر ہے جو چیز کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے، وہ اس سے زیادہ بہتر ہے جو اپنے مفہوم میں تشریح کی محتاج ہو۔اس بنیاد پر اگر انہوں نے فتح کی قراءۃ کو اختیار کیا ہے تو اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ وہ رفع (پیش) کی قراءت کا انکار کر رہے ہیں۔

3۔ اس حوالے سے تیسری مثال جو گولڈ زیہر نے پیش کی ہے، وہ سورۃ العنکبوت کی یہ دو آیات ہیں:

﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝﴾ (العنکبوت: 2-3)

گولڈ زیہر لکھتا ہے:

''ان کلمات کے تناظر میں یہ تصور سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سچے کی سچائی اور جھوٹے کا جھوٹ معلوم کرنے کے لیے امتحان و آزمائش کی ضرورت ہے، گویا اس کے بغیر وہ سچ اور جھوٹ کو نہیں جان سکتا۔گویا قضاوقدر کے فیصلے اس

نے خود نہیں کیے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امام زہری رحمہ اللہ کی طرف منسوب قراءۃ کا مقصد اسی شبہ کا ازالہ تھا۔ یہ قراءۃ یاء کی پیش اور لام کی زیر کے ساتھ "فَلَيُعْلِمَنَّ" ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی پہچان ضرور کروا دے گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسا امتیازی نشان عطا کر دے جسے دیکھ کر لوگ انہیں پہچان لیں گے۔ چنانچہ سچے لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں سیاہ یا سرمئی ہوتی ہیں اور جھوٹے لوگوں کی علامت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں نیلگوں ہوتی ہیں۔ نیلگوں آنکھیں عربوں کے ہاں بد خصلت اور خباثت کی علامت اور قبیح تصور کی جاتی ہیں اور لوگ ان سے بدشگونی لیتے ہیں اور بعض دفعہ ایسی آنکھیں ان کے ہاں انتہائی خوفناک جادوئی طاقت کی حامل متصور ہوتی ہیں۔''

گولڈ زیہر کا یہ پورا اقتباس یا اس کا اکثر حصہ ابو حیان اندلسی، امام قرطبی اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی تفسیر سے نقل کیا گیا ہے۔ باقی جہاں تک حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات کی طرف منسوب اس قراءۃ کا تعلق ہے تو یہ نہ تو ائمہ عشرہ سے مروی ہے اور نہ ہی قراءات شاذہ کے راویوں میں سے کسی نے اسے روایت کیا ہے اور نہ ہی ان لوگوں نے اسے روایت کیا ہے جن کی طرف شاذ و نادر قراءات کی نسبت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم کیسے مان سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امام زہری رحمہ اللہ نے اس قراءۃ کو بیان کیا ہوگا۔

بفرض محال اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ و دیگر کی طرف اس قراءۃ کی نسبت ثابت بھی ہو جاتی ہے تو بھی یہاں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس لیے اس میں ترمیم کی کہ یہ اسلام کے کسی مسلمہ عقیدہ سے متصادم تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو اسی مفہوم کی دیگر آیات قرآنیہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہیے تھی۔ اگر فی الواقع ایسا ہی تھا تو اسی مفہوم کی حامل دیگر آیات میں تبدیلی کا خیال انہیں کیوں نہ آیا؟ جیسا کہ سورۃ آل عمران میں فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ

الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا﴾ (آل عمران: 166، 167)

اور سورۃ الحدید میں اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ (الحدید: 25)

بلکہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جو ان آیات کی نسبت زیادہ پرزور انداز میں اس مفہوم کو بیان کر رہی ہیں، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے علاوہ کسی کو بھی ان آیات کی قراءت میں ترمیم کی جرأت نہ ہوئی۔ سورۃ آل عمران کی یہ آیت ملاحظہ فرمایئے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ اور سورۃ التوبہ کی اس آیت کو بھی پڑھ لیجئے: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً﴾ (التوبۃ: 142)

ہمارا یہ ایمان ہے کہ کوئی بھی مسلمان، خواہ وہ کیسا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، قرآن کریم میں ترمیم وتبدیلی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا، خواہ اس کے نتیجے میں کیسی اعلیٰ قسم کی اصلاح ہو رہی ہو۔ جب رسول اللہ کو اللہ عزوجل کی طرف سے یہ حکم تھا کہ ﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ﴾ کہ ان سے کہو ''میرا یہ کام نہیں کہ اپنی طرف سے اس میں کچھ ترمیم کرلوں، میں تو بس وحی کا پیرو ہوں، جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔'' تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کوئی اور اپنی طرف سے قرآن کریم میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کرنے کی جرأت کرتے۔ یہ شبہ پہلی دفعہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بھی یہ شبہ لوگوں کے ذہنوں میں گردش کر رہا تھا۔ لیکن علمائے سلف، محدثین اور ائمہ مفسرین، خصوصاً علمائے متکلمین نے اس شبہ کو پیش کرنے کے بعد اس کا جواب دیا، آیات کے مفاہیم کو واضح کیا اور ثابت کیا کہ یہ آیات اسلام کے کسی اساسی عقیدہ یا اصول شریعت سے متصادم نہیں ہیں۔ اس مقام پر بھی علمائے تفسیر نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو چیز ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئی، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق بھی اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ وہ چیز ابھی واقع نہیں

ہوئی۔ اور جو چیز وقوع پذیر ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق اس کے ساتھ اسی لحاظ سے متعلق ہوتا ہے کہ وہ واقع ہو چکی ہے۔ علماء نے اس آیت کی یہ تاویل بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ سچوں کے سچ اور جھوٹوں کے جھوٹ کو جان لیں گے اور اللہ عزوجل کا یہ جاننا ان دونوں کے وقوع پذیر ہونے کی نسبت سے ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے یہ جانتا ہے کہ یہ دونوں وقوع پذیر نہیں ہوئے ہیں اور مومنین اور منافقین کو جاننے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے ایمان اور منافقین کے نفاق وقوع پذیر ہونے کو جان لے، جیسا کہ ان کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے وہ یہ جانتا ہے کہ یہ وقوع پذیر نہیں ہوئے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ﴾ میں "لَمَّا" نافیہ اور "لَمْ" کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی مجاہدین کے جہاد اور اس کی خاطر صبر کرنے والوں کے صبر کو تو جانا (دیکھا) ہی نہیں، اس حال میں کہ یہ جہاد اور صبر عملاً ظہور پذیر ہو چکے ہوں۔ جس طرح کہ ان کا عدم وقوع اس کے علم میں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم قدیم ہے، جس سے پہلے جہالت نہیں تھی۔ اللہ کی ذات صفتِ جہالت سے بالاتر ہے۔ اور اللہ کی صفتِ علم تبدیل نہیں ہوتی، بلکہ اس صفتِ علم اور شیء کے مابین جو تعلق ہے تبدیلی اس میں واقع ہوتی ہے۔ پس جب کوئی شیء وقوع پذیر ہو جائے تو اس سے متعلق صفتِ علم اور جب تک وہ وقوع پذیر نہ ہوئی ہو، اس سے متعلق صفتِ علم کے مابین فرق ہوتا ہے۔

4۔ اس حوالے سے <u>چوتھی مثال</u> جو گولڈ زیہر نے پیش کی ہے، وہ سورۃ المائدہ کی یہ آیت ہے:

﴿اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ٥﴾

اس کے ضمن میں گولڈ زیہر اپنی کتاب کے صفحہ 36 پر لکھتا ہے:

''حواری اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کے بعد یہ سوال کر رہے ہیں

کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے؟ اس طرح کا سوال، ناممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی زبان سے صادر ہوا ہو، لہٰذا بعض نے اسے صیغہ مخاطب اور لفظ "ربک" کی باء کی زبر کے ساتھ ﴿هَلْ تَسْتَطِيعُ رَبَّكَ﴾ پڑھ دیا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کیا آپ اپنے رب کے سامنے یہ سوال رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار دے۔"

گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ "کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے؟ حواریوں کی زبان سے اس طرح کے سوال کا صادر ہونا ناممکن ہے۔" اس قراءۃ کے انکار کے مترادف ہے۔ حالانکہ یہ مدینہ، مکہ، شام اور بصرہ کے تمام قراء اور کوفہ کے اکثر قراء کی قراءۃ ہے۔ اور یقیناً تواتر سے ثابت ہے، لہٰذا اس یقینی اور قطعی قراءۃ کا انکار اور اس کے ثبوت میں شک وشبہ پیدا کرنے کی کوئی گنجائش یہاں نہیں ہے۔

باقی جہاں تک اس کے مفہوم کا تعلق ہے تو یہ قراءۃ اگرچہ اسی سورت کی آیت ﴿قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ﴾ اور حواریوں کے ایمان کے بظاہر منافی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آیا ہے، ہر چیز پر اللہ کی قدرت کا معترف ہوگیا ہے اور اللہ کے صادق وامین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر چکا ہے، وہ یقیناً اللہ کی قدرت کے بارے میں اس قسم کے شک کا اظہار نہیں کر سکتا۔ لیکن مفسرین نے اس قراءۃ کی ایسی خوبصورت تعبیرات پیش کی ہیں جو عربی زبان وادب، آیت کے سیاق وسباق اور حواریوں کے ایمان کے عین مطابق ہیں۔ ذیل میں ہم اس کی چند تعبیرات پیش کر رہے ہیں:

"يَسْتَطِيعُ" میں سین اور تاء زائدہ ہیں۔ عربوں کا اسلوب ہے کہ وہ نظم ونثر میں اکثر سین اور تاء بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے کلام میں "استجاب" کا لفظ "أجاب" کے مفہوم میں اور "استطاع" کا لفظ "أطاع" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اے عیسیٰ بن مریم! اگر ہم آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتارنے کا مطالبہ

کریں تو کیا آپ کا رب آپ کی دعا قبول کرے گا؟ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(ا)...... "یستطیع" یہاں مجازاً "یستجیب" کے معنی میں ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر آپ اپنے رب سے درخواست کریں تو کیا وہ قبول کرے گا۔ یہ امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

(ب)...... "هَلْ يَسْتَطِيعُ" یہاں "هل يفعل ذلك و يحققه" کے معنی میں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار دے گا اور ہماری اس خواہش کو عملی جامہ پہنا دے گا؟ ان کا یہ کہنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی آدمی سے کہتے ہیں کہ کیا فلاں شخص یہاں آسکتا ہے؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ واقعی آسکتا ہے۔ تو اس پوچھنے کا معنی یہ ہوگا کہ کیا وہ اس کام کو عملی جامہ پہنائے دے گا؟ کلام عرب میں اس تعبیر کو مجاز مرسل کہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں استطاعت جو کہ سبب ہے کو چھوڑ کر مسبب یعنی آنا مراد لیا گیا ہے۔ اور اہل عرب کا یہ اسلوب ہے کہ وہ مجاز اور اس کی تمام اقسام کو نظم ونثر اور دیگر اصناف گفتگو میں اختیار کرتے ہیں۔ مجاز دراصل حقیقت کی نسبت زیادہ فصاحت وبلاغت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس اسلوب گفتگو میں دعوے کے ساتھ اس کی دلیل بھی پنہاں ہوتی ہے۔ گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ کیا فلاں شخص آئے گا؟ اسے آنا چاہیے، کیونکہ وہ آنے پر قادر اور آنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ آیت کریمہ کی یہ تعبیر گویا ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی سے کہتے کہ کیا آپ میرے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ مخاطب ایسا کر سکتا ہے اور اس پر قدرت رکھتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک تابعی یحیی المازنی رحمہ اللہ نے اپنے باپ صحابی رسول عبد اللہ بن زید بن عاصم رحمہ اللہ سے کہا: ﴿هَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُرِيَنِي كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ؟﴾ "کیا آپ مجھے اسی طرح وضو کر کے دکھا سکتے ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ وضو کیا کرتے تھے؟" حالانکہ انہیں علم ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ تو ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا آپ میری اس آرزو کو پورا کریں گے؟ تو اس بحث کے تناظر میں آیت کریمہ کا مفہوم یہ سامنے آتا ہے کہ اے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام! کیا اللہ تعالیٰ آپ کی درخواست پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان نازل

کر دے گا؟ اگر کر دے گا تو پھر اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ وہ اسے نازل کر دے۔

(ج)...... تیسری تعبیر یہ بیان کی گئی ہے کہ حواریوں کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا آسمان سے کھانے کا خوان نازل کرنا اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت اور اس کی حکمتِ الٰہیہ کے مطابق ہے؟ تاکہ ہم اس کا مطالبہ کریں۔ یا یہ مطالبہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے قانونِ قدرت کے منافی ہے، کہ ہم اس سے باز رہیں، کیونکہ ایسا کرنا اگرچہ ذاتِ الٰہی کے لیے ناممکن نہیں ہے، لیکن اس کے قانونِ قدرت اور اس کی حکمت کے منافی ہونے کی وجہ سے اس کا مطالبہ کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ گویا حواری یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آسمان سے خوان کو نازل کرنا، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے ازل سے کر رکھا ہے اور ہم اس کے مطالبے کے مجاز ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ نے ازل سے اس کا فیصلہ ہی نہیں کیا اور ہم اس کے مطالبے کے مجاز ہی نہیں ہیں؟

(د)...... ابو حیان اندلسی رحمہ اللہ نے "البحر المحیط" میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''حواریوں کی بات کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انہیں اس میں شک ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار چاہتے تھے کہ اللہ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ قطعاً مشکل نہیں ہے، وہ یقیناً ہمارے لیے آسمان سے کھانے کا خوان نازل کر سکتا ہے۔ جیسے ایک شخص کسی کمزور اور بوڑھے شخص کا ہاتھ تھام کر کہے کہ کیا حکمران وقت ایسا کر سکتا ہے؟ اس سے اس کا مقصد یقیناً یہ بتانا ہے کہ ہاں حکمران وقت یقیناً ایسا کر سکتا ہے، یہ بالکل واضح بات ہے، کوئی ذی ہوش انسان اس میں شک نہیں کر سکتا۔ تو یہاں مقصد سوال نہیں، بلکہ ایک حقیقتِ ثابتہ کا اظہار ہے۔''

(ھ)...... علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''حواریوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں قطعاً شک کا اظہار نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ سچے مومن اور بخوبی جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے خوان اتارنے اور ہر کام کی طاقت رکھتا ہے، لیکن ان کا یہ علم دلیل، خبر اور عقل کی بنیاد پر تھا۔ لہٰذا وہ اپنی

آنکھوں سے اللہ کی قدرت کا نظارہ کرنا چاہتے تھے، جس طرح کے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے کہا تھا: ﴿رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَى﴾ (البقرۃ: 260) کہ "اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟" حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم خبری اور نظری تو حاصل تھا، لیکن وہ چاہتے تھے کہ حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے جس پر ایمان لانے کی دعوت انہیں دنیا کو دینا تھی۔ کیونکہ علم خبری اور نظری میں شبہات اور اعتراضات کو دخل ہو سکتا ہے، لیکن مشاہدہ عینی میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا حواریوں نے کہا تھا: ﴿وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا﴾ کہ "(ہم بس یہ چاہتے ہیں) کہ ہمارے دل مطمئن ہوں۔" یہی بات ابراہیم علیہ السلام نے کہی تھی: ﴿وَلَكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾ کہ "(ایمان تو رکھتا ہوں) مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔" تو ثابت ہوا کہ حواری ایمان میں سچے تھے اور ان کی طرف سے خوان اتارنے کا مطالبہ دلی اطمینان کیلئے تھا۔ اس بنیاد پر فرمان الٰہی: ﴿إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (المائدۃ: 112) کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تمہارا ایمان اور اخلاص مکمل ہے۔ اور ﴿وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا﴾ (المائدۃ: 113) کا معنی یہ ہوگا کہ ہم ایمان غیبی، یقین غیبی کے ساتھ تو جان چکے اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم مشاہدہ عینی کے ساتھ بھی اس حقیقت کو جان لیں۔"

جب آیت کریمہ کی مذکورہ تمام تعبیرات آیت کی روح اور فحوائے کلام کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور اس آیت کے حقیقی منشا کے مطابق ہیں۔ آیات کا سیاق وسباق بھی ان کی مکمل تائید کر رہا ہے اور اسالیب عربیہ اور بلاغت کی تعبیرات بھی ان تاویلات کی پشت پر کھڑی ہیں تو اس کے باوجود اس قراءۃ کا انکار کرنا کسی طور بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اسے پورے اطمینان و یقین کے ساتھ قبول کر لیا جائے، اور منکرین کو دو ٹوک جواب دیا جائے۔ اس واضح حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ قراءۃ متواتر ہے اور ایسے یقینی اور

قطعی ذریعہ سے ثابت ہے، جس سے اعراض اور اس مسلمہ امر میں شک وتردد کی قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

5۔ اس حوالہ سے پانچویں مثال جو گولڈ زیہر نے پیش کی ہے، وہ سورۃ الانبیاء کی یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿قَالَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ٥﴾ (الانبیاء: 112)

اس کے ضمن میں گولڈ زیہر نے اپنی کتاب کے صفحہ 37 پر یہ لکھا ہے:

”قراء میں سے ایک ثقہ قاری کو یہ اچھا نہیں لگا کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ سے حق کے ساتھ فیصلہ کرنے کا مطالبہ کریں۔ گویا اللہ کے بارے میں یہ امکان بھی موجود ہے کہ وہ ناحق فیصلہ بھی کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس شبہ کے ازالہ کے لیے اس نے حرکات کی تبدیلی کا سہارا لے کر امر حاضر کے صیغہ کو صیغہ ”اسم تفضیل“ سے بدل دیا اور سلسلہ کلام نے انشاء کی بجائے یوں خبر کا روپ دھار لیا: ﴿رَبِّ أَحْكَمُ بِالْحَقِّ﴾ یعنی میرا رب کسی بھی حاکم سے بڑھ کر حق فیصلہ کرنے والا ہے۔“

اب گولڈ زیہر کے اقتباس کے نکات پر ہمارا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

* گولڈ زیہر کا یہ دعویٰ کہ اس قراءۃ کا راوی ثقہ قراء میں سے ہے، سراسر جھوٹ اور خیانت در خیانت کے مترادف ہے۔ اس قراءۃ کا راوی ضحاک بن مزاحم (م 105ھ) ہے۔ اور ضحاک رحمہ اللہ کا سرے سے طبقہ قراء ہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، چہ جائیکہ کہ اس کا تعلق مستند قراء سے ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ ضحاک سے قراءات کے مسلمہ معیار اور اصولوں کے مطابق ایک بھی قابل اعتماد قراءۃ مروی نہیں ہے۔
* اگر ضحاک رحمہ اللہ نے اپنی طرف سے امر حاضر کے صیغہ کو صیغہ ”اسم تفضیل“ سے بدلا بھی ہے، تو اس سے قراءات کی حجیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہم بارہا وقعہ قطعی دلائل سے یہ واضح کر چکے ہیں کہ کوئی بھی قراءۃ اس وقت تک قابل التفات نہیں ہے جب تک وہ

انتہائی مستند ذریعہ سے براہ راست نقل در نقل ثابت نہ ہو۔ ❶

❁ گولڈ زیہر کے دماغ نے آیت میں لفظ "الحق" کے معنی کو سمجھنے میں بھی لغزش کھائی ہے۔ گولڈ زیہر نے اسے عدل کے معنی میں لیا ہے، جس کا معنی ہے کہ ظلم و نا انصافی سے احتراز کرتے ہوئے ہر چیز کو اس کے موقع و محل پر رکھنا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں آیت میں "الحق" سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ! ان کفار و مشرکین کے لیے سزا کا فیصلہ جلدی فرما دے۔ دنیا میں ہی ان پر اپنا عذاب مسلط کر دے اور انہیں روز قیامت تک ڈھیل نہ دے۔ یہ ہے وہ حق، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے رب سے اس کے مطابق کافروں کے خلاف فیصلہ کرنے کی درخواست کریں۔ اسی کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ((اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ)) کہ "اے اللہ! قبیلہ مضر کو سختی سے کچل دے۔" چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت ﴿رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ کے بارے میں فرمایا ہے:

"صرف اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جو حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، لیکن یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کو جلد دنیا میں ہی سزا سے دوچار کرنے کا سوال کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا کو قوم کے خلاف قبول کیا اور انہیں غزوہ بدر میں سخت سزا کا مزا چکھا دیا۔"

ہم گولڈ زیہر سے پوچھتے ہیں کہ مذکورہ آیت اور سورۃ الاعراف کی یہ آیت: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝﴾ (الاعراف: 89) دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، تو پھر اس آیت کو تمام قراء نے بالاتفاق ایک ہی طریقہ پر کیوں پڑھا ہے؟! اگر تبدیلی کا باعث آپ کا یہی مزعومہ خدشہ تھا تو پھر یہاں 'ثقہ قاری' کو اس کا خیال

---

❶ حیرت ہے گولڈ زیہر تاریخ قراءات کی اس مسلمہ حقیقت کو کیوں فراموش کر رہا ہے؟! اگر یہ حقیقت اس کے پیش نظر ہوتی تو وہ کبھی بھی قراءات قرآنیہ کو تختۂ مشق نہ بناتا اور اگر اس نے جانتے بوجھتے اس حقیقت سے چشم پوشی کی ہے تو علم کی دنیا میں اسے بددیانتی اور اندھے تعصب کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

کیوں نہیں آیا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ قراءۃ ایک منکر قراءۃ ہے۔قراءات متواترۃ کے دس قراء میں سے کسی نے اسے روایت نہیں کیا۔اور نہ ہی قراءات شاذۃ کے چار قراء میں سے کسی نے اسے روایت کیا ہے، جو بالاتفاق شاذ اور قابل رد ہیں۔اور ضحاک کی طرف منسوب یہ قراءۃ انتہائی شاذ اور پرلے درجے کی غریب اور منکر قراءۃ ہے۔کوئی ذی ہوش انسان ایسی قراءۃ کو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت دینے کا روادار نہیں ہوسکتا۔

اس پر مستزاد یہ کہ یہ قراءۃ رسم مصحف عثمانی کے بھی خلاف ہے کیونکہ اس میں لفظ (رب) کے بعد یاء کا اضافہ ہے۔اور امت کے تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ہر وہ قراءۃ جو مصاحف عثمانیہ کے رسم کے خلاف ہو، قابل رد ہے۔

6۔ چھٹی مثال جو گولڈ زیہر نے اس حوالہ سے پیش کی ہے، وہ سورۃ البقرۃ کی یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (البقرۃ: 106)

گولڈ زیہر نے اس آیت کے ضمن میں، اپنی کتاب کے صفحہ 38 پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نے بعض علماء کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے پہلے نون کی پیش اور دوسرا نون ساکن اور سین کی زیر کے ساتھ "نُنْسِهَا" کی قراءۃ کو نامناسب اور بعید خیال کیا ہے۔ ❶

حالانکہ یہ متواتر قراءۃ ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست حاصل کیا، پھر ان سے تابعین کی ایک بڑی تعداد نے حاصل کیا، اسی طرح ہر

❶ یہاں پھر گولڈ زیہر نے بعض علماء کے مبہم الفاظ سے حقائق پر پردہ ڈالنے اور اپنے ذوق خیانت کو غذا دینے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ اس نے ضحاک بن مزاحم کی طرف منسوب قراءۃ کو ثقہ قراء کی قراءۃ قرار دے کر دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔ اور یہاں ایک ثابت شدہ قراءۃ کو بعض علماء کی قراءۃ کہہ کر ابہام پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دور میں ان گنت تعداد کو اپنے جلو میں لیے ہوئے یہ سلسلہ ہم تک پہنچا۔ ❶ اس کے بعد گولڈزیہر نے اس آیت میں مزید تین قراءات ذکر کی ہیں:

پہلی قراءۃ: تاء کی زبر، نون ساکن، اس کے بعد سین کی زبر اور الف کے ساتھ "تَنْسَاھَا" ہے۔ یہاں بھی گولڈزیہر لغزش کا شکار ہوئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قراءۃ اس طرح نہیں، بلکہ سین کے بعد حذف الف کے ساتھ "تَنْسَھَا" ہے۔ کیونکہ اس کا عطف "نَنْسَخْ" کے اوپر ہے اور "نَنْسَخْ" حرف جازم کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور دوسری اہم ترین حقیقت کہ یہ قراءۃ شاذ ہے، کسی بھی معین اور ثقہ قاری نے اسے روایت نہیں کیا، نہ قرائے عشرۃ میں سے کسی نے اور نہ ہی قراءات شاذۃ کے چار قراء میں سے ہی کسی نے اس کو روایت کیا ہے۔ امت نے اپنی پوری تاریخ میں ایسی کسی قراءۃ کو قرآن قرار نہیں دیا۔

دوسری قراءۃ: "نَنْسَاھَا" نون کی زبر، پھر نون ساکنہ، اس کے بعد سین کی زبر اور ہمزہ ساکنہ کے ساتھ، اس کا مصدر "إنساء" ہے۔ اس کا معنی: موخر اور ملتوی کرنا ہے۔ اور یہ "أَوْ نُنْسِھَا" کی طرح متواتر قراءۃ ہے۔

تیسری قراءۃ: "تَنْسَاھَا" یہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے۔ یہ قراءۃ لفظی اور معنوی اعتبار سے بالکل دوسری قراءۃ کی طرح ہے۔ اس کا مصدر "إنساء" ہے، یہ بھی تاخیر اور التوا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں ہمزہ کو تخفیف (آسانی) کے لیے الف سے بدل دیا گیا ہے۔

اور گولڈزیہر کا کہنا کہ "اس قراءۃ میں نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔" فاش غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا مصدر نسیان نہیں ہے۔ اگر اس کا مصدر نسیان ہوتا تو پھر اسے فعل مجزوم پر عطف کی وجہ سے حذف الف کے ساتھ "تَنْسَأَھَا" ہونا چاہیے

---

❶ طرفہ تماشا دیکھیے! ایک طرف یہ یہودی مستشرق ایک انتہائی شاذ اور خود ساختہ قراءۃ کو بعض ثقہ قراء کی قراءۃ قرار دے کر حقائق کو مسخ کرنے کا کام کر رہا ہے تو دوسری طرف ایک متواتر اور قطعی ذرائع سے ثابت قراءۃ کو بعض علماء کی قراءۃ کہہ کر قارئین کو دھوکہ دینے کی سعی مذموم کر رہا ہے۔

تھا۔ نیز "تَنْسَاهَا" کے ضبط کے ساتھ کسی قراءۃ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ قراءات متواترہ، عشرہ، شاذہ اور دیگر ضعیف اور موضوع قراءات میں اس قراءۃ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ باقی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا اس قراءۃ کو رد کرنا اور یہ کہنا کہ قرآن کریم مسیب رحمہ اللہ اور آل مسیب پر نازل نہیں ہوا، ان کا یہ ردعمل اس وجہ سے نہیں تھا کہ اس قراءۃ میں کوئی معنوی بگاڑ ہے، بلکہ اس وجہ سے تھا کہ یہ قراءۃ صحیح ثابت نہیں ہے۔

7۔ <u>ساتویں مثال</u> جو گولڈ زیہر نے اس حوالے سے پیش کی ہے، وہ سورۃ المائدۃ کی یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَمِنَ الْآثِمِينَ﴾

(المائدۃ: 106)

گولڈ زیہر اپنی کتاب کے صفحہ 39 پر لکھتا ہے کہ:

"اس آیت میں گفتگو کا موضوع زبانی وصیت ہے کہ "جب گواہوں کی سچائی کے متعلق معمولی سا شک ہو جائے تو پھر وہ اللہ کی قسم اٹھا کر کہیں کہ ہم کسی ذاتی فائدے کی خاطر شہادت بیچنے والے نہیں ہیں اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔" شاید عامر الشعبی رحمہ اللہ (المتوفی 103ھ) نے سوچا کہ "شَهَادَةَ اللَّهِ" کو کتمان کا مفعول بنانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوگا کہ ایسی چیز کو چھپانا بھی ممکن ہے، جس کا گواہ خود اللہ تعالیٰ ہو۔ لہٰذا انہوں نے اس تاثر کو ختم کرنے کے لیے اضافت کو حذف کر کے لفظ

شہادت کو تنوین کے ساتھ اور لفظ اللہ کے ہمزہ کو نیا جملہ بنا کر مد کے ساتھ یوں پڑھ دیا: "وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةً آللّٰهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ" یعنی "اللہ" اللہ کی قسم" تو یہاں استفہام واو قسمیہ کے بدلے میں ہے۔"

گولڈ زیہر کی کج فہمی:

نہ معلوم گولڈ زیہر کو کہاں سے یہ ابہام ہو گیا کہ امام شعبی رحمہ اللہ نے اس لیے قراءۃ متواترہ سے انحراف اختیار کیا کہ "شَهَادَةَ اللّٰهِ" کو کتمان کا مفعول بنانا شان الٰہی کے مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس سے یہ تاثر پیدا ہو گا کہ ایسی چیز کو چھپانا بھی ممکن ہے، جس کا گواہ خود اللہ تعالیٰ ہو۔ حالانکہ امام شعبی رحمہ اللہ سے اس طرح کا کوئی معنی منقول نہیں ہے۔ گولڈ زیہر ایسی بات امام شعبی رحمہ اللہ کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے جو ان کے وہم و گمان میں بھی شاید نہ ہو بلکہ امام شعبی رحمہ اللہ اور ہر وہ شخص جو عربی اسالیب اور قرآنی تراکیب کا ادنیٰ ذوق بھی رکھتا ہے، اس سے یہی سمجھے گا کہ "ہم اس گواہی کو چھپانے والے نہیں ہے، جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض اور اس کو چھپانا ممنوع قرار دیا ہے۔" اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہاں شہادت کی نسبت اپنی ذات کی طرف اس لیے کی ہے کہ وہ خود ہی اس کا حکم دینے اور اسے مشروع قرار دینے والا ہے۔

باقی رہی امام شعبی رحمہ اللہ کی طرف منسوب یہ قراءۃ تو اس کا تعلق بھی ان قراءتوں میں سے ہے جو انتہائی شاذ اور غریب ہیں۔ اسی لیے قراء کے ہاں اس کا ذکر تک نہیں ہے۔

8۔ آٹھویں مثال جو گولڈ زیہر نے اس حوالہ سے پیش کی ہے، وہ سورۃ البقرۃ کی آیت ﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا﴾ ہے۔

گولڈ زیہر اپنی کتاب کے صفحہ 39 پر لکھتا ہے:

"اس قسم کی اصلاحات جن کا مقصد اللہ تعالیٰ کے بارے میں شبہات کا ازالہ تھا، ان کا اصل محرک خدا خوفی اور تقویٰ ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہی محرک اس آیت میں بھی اصلاح کا باعث بنا، جس میں یہودیوں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ

﴿فَاِنْ آمَنُوْا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ ''پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پر ہیں۔''بعض متقی اور پرہیزگار دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ لفظ ''مثل'' کی ترجمانی اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک مثل کو وضع کر رہی ہے، اور یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اس مثل پر ایمان لاتے ہیں۔ حالانکہ اگر لغوی اعتبار سے غور وفکر کیا جاتا تو اس شبہ کی اصلاً کوئی بنیاد نہیں تھی، چنانچہ ان متقی لوگوں نے ایک بنیادی تبدیلی کے ذریعے اس شبہ کا ازالہ کر دیا جو ان کے دلوں میں شک پیدا کر رہا تھا۔ اور آیت سے لفظ (مثل) جس نے یہ شبہ ابھارا تھا، کو حذف کر کے یوں پڑھ دیا: فَاِنْ آمَنُوْا بِمَا مَا آمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔''

گولڈ زیہر کی تخمین سازی کا جائزہ:

آیت کریمہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ اس میں کسی شبہ کا شائبہ تک نہیں ہے۔ پوری آیت میں کہیں کوئی اشارہ تک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک یا نظیر بھی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یہودی اللہ تعالیٰ، تمہارے نبی، آپ سے پہلے آنے والے انبیاء اور وہ تمام کتابیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر نازل کی تھیں، اُن پر اسی طرح ایمان لے آئیں، جس طرح تم ایمان لائے ہو۔ اسی طرح ان کی تصدیق کریں، جس طرح تم نے کی ہے اور اسی طرح رسولوں کو بلا تفریق حق تسلیم کریں، جس طرح تم نے تمام رسولوں کو بلا تفریق حق تسلیم کیا ہے تو یہ بھی اسی طرح ہدایت پا جائیں گے جس طرح تم ہدایت پا چکے ہو۔ آیت میں دو ایمانوں کے درمیان مماثلت کا ذکر ہے، ایک طرف یہودیوں کا ایمان اور دوسری طرف مومنین (صحابہ) کا ایمان ہے۔ دو معبودوں کے درمیان مماثلت کا ذکر نہیں ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کا معبود ہے اور دوسری طرف یہودیوں کا معبود ہے۔ اس کے قریب ترین بات علامہ نیشاپوری نے کہی ہے کہ فرمان الٰہی: ''فَاِنْ آمَنُوْا'' میں کلمہ شرط اس بات کی دلیل ہے کہ معاملہ کو فرض (Supose) کرنے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر یہ

لوگ تمہارے دین جیسا کوئی دین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو صحت اور راست روی میں تمہارے دین کے مساوی ہو تو یہ ہدایت پر ہیں۔ لیکن روئے ارض پر اس دین کے سوا کوئی ایسا صحیح دین موجود نہیں ہے جو تضاد اور تناقض سے پاک ہو، لہٰذا دین اسلام کو قبول کیے بغیر ہدایت ممکن نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کے سامنے اپنی رائے پیش کریں جسے آپ پورے اعتماد اور یقین سے صحیح سمجھتے ہیں اور اس سے کہیں کہ یہی درست رائے ہے اور اگر آپ کے پاس اس سے زیادہ صائب رائے موجود ہے تو اس پر عمل کر لیجئے اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں تیری رائے کو درست نہیں سمجھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود تیری خواہش یہ ہے کہ تو اپنے دوست کی اس بات پر سرزنش کرے کہ وہ اس کا ہم خیال نہیں ہے۔

باقی رہی وہ قراءۃ جو گولڈ زیہر نے اپنے ذاتی تخیل کو جواز فراہم کرنے کے لیے پیش کی ہے۔ تو قراء کے نزدیک بالاتفاق اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ یہ قراءۃ تمام مصاحف عثمانیہ کے رسم کے خلاف ہے۔ اور امت مسلمہ کے تمام قراء اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی بھی قراءۃ جو رسم مصحف کے خلاف ہوگی، قبول نہیں کی جائے گی۔ اس لحاظ سے یہ قراءۃ قطعاً ناقابل اعتبار ہے۔

9۔ نویں مثال جو گولڈ زیہر نے اس حوالے سے پیش کی ہے، وہ سورۃ آل عمران کی یہ آیت ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ﴾ (161)

گولڈ زیہر نے اپنی کتاب کے صفحہ 40 پر لکھا ہے کہ "اس آیت میں دو قراءاتیں ہیں: پہلی قراءۃ: "یَغُلَّ" فعل معروف کی بناء پر یاء کی زبر اور غین کی پیش کے ساتھ ہے۔ دوسری قراءۃ: "یُغَلَّ" فعل مجہول کی بناء پر یاء کی پیش اور غین کی زبر کے ساتھ ہے۔"

واضح رہے کہ مذکورہ دونوں قراءاتیں متواتر ہیں۔ صحابہ کرام، تابعین اور مشاہیر ثقہ قراء کی ایک بڑی تعداد نے ان دونوں قراءات کو پڑھا ہے۔

پہلی قراءۃ کا معنی یہ ہے کہ کسی نبی کے بلند منصب اور عظیم مقام ومرتبہ کے لیے مناسب ہے نہ اس کا یہ فریضہ اور نہ ہی اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ مال غنیمت وغیرہ میں خیانت کرے۔ یہ عام حکم ہے جو تمام انبیاء کے بارے میں مال غنیمت وغیرہ میں ارتکاب خیانت

کے امکان کی نفی کر رہا ہے۔

آیت کا مقصد ان کمزور ایمان لوگوں اور منافقین کا رد کرنا ہے، جنہوں نے بدر کے دن گم ہونے والی ایک چادر کے بارے میں کہا کہ شاید یہ رسول اللہ ﷺ نے لے لی ہو تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ واضح کر دیا گیا کہ نبوت جیسا عظیم الشان منصب اور خیانت جیسی رذیل حرکت دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہ دو باہم متضاد اور متناقض چیزیں ہیں۔ نبی کی ہستی اس قسم کے گھٹیا اخلاق سے پاک ہوتی ہے۔ نبی کے بارے میں اس قسم کا خیال بھی دل میں لانا روا نہیں ہے۔ آیت میں اس شخص کے لیے تنبیہ ہے، جس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے ایسا گھٹیا خیال پیدا ہوا تھا کہ پیغمبر کی ہستی اس سے کہیں بلند تر ہے۔ اور یہ چیز آپ کی وسعت قلبی کے بھی سراسر منافی ہے۔

دوسری قراءۃ کا معنی یہ ہے کہ کسی نبی علیہ السلام کے یہ شایان شان نہیں ہے کہ اس کی طرف خیانت کی نسبت کی جائے۔ بعض محققین کے نزدیک اس قراءۃ کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کے یہ شایان شان نہیں کہ اسے خائن پایا جائے۔ اس میں ہمزہ وجدان یعنی کسی چیز کے کسی خاص حالت میں پائے جانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور یہ اہل عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: أغللته إذا وجدته غالا ، أبخلته وجدته بخيلا . اس لحاظ سے دونوں قراءتوں کے مفہوم میں کوئی تضاد نہیں، دونوں ایک ہی مفہوم کی ترجمان اور باہم ایک دوسرے کی تائید کر رہی ہیں۔ پہلی اور دوسری قراءۃ میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس سے آپ کے مرتبہ نبوت پر حرف آتا ہو اور آپ کی عظمت نبوت کو ٹھیس پہنچتی ہو۔ ❶

---

❶ جیسا کہ گولڈ زیہر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ فعل معروف کی قراءۃ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ایک غیر مناسب کام کی نسبت سے آپ کی شان نبوت پر حرف آنے کا اندیشہ تھا، لہٰذا اس اشکال کو زائل کرنے کے لیے قراء نے فعل مجہول کی قراءۃ کو وضع کیا۔ گولڈ زیہر عجیب ذہنی کشمکش اور فکری تضاد کا شکار ہے۔ اگر قراء نے فعل مجہول کی قراءۃ کو اس موہوم اشکال کو رفع کرنے کے لیے وضع کیا تھا تو پھر انہوں نے فعل معروف کی قراءۃ کو کیوں باقی رہنے دیا؟ اسے مصحف سے نکال باہر کیوں نہیں کیا؟ کیا گولڈ زیہر کو معلوم نہیں کہ یہ قراءۃ بھی اسی طرح متواتر اور کلام اللہ ہے۔ قرائے سبعہ میں سے ابن کثیر، ابو عمرو اور امام عاصم رحمہ اللہ نے اسے پڑھا ہے؟ شعور و فکر کی یہ کافری معاذ اللہ!

10۔ دسویں مثال جو گولڈ زیہر نے اس حوالہ سے پیش کی ہے، وہ سورۃ یوسف کی یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَن نَّشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾

(یوسف: 110) ❶

گولڈ زیہر کی بددیانتی کا جائزہ:

واضح رہے کہ اس آیت میں تین قراءات ہیں:

پہلی: "كُذِّبُوا" کاف کے پیش اور ذال مکسورہ کے شد کے ساتھ اور دوسری: "كُذِبُوا" کاف کی پیش اور ذال مکسورہ کی تخفیف (بغیر شد) کے ساتھ۔ اور تیسری: "كَذَبُوا" کاف کی زبر اور ذال کی تخفیف کے ساتھ۔

ان میں سے پہلی دو قراءات متواتر ہیں اور تیسری شاذ اور ناقابل اعتبار ہے۔ نیز قدیم اور معاصر علماء نے بغیر کسی حیرت و پریشانی کے ان قراءات کی ایسی توجیہات و تعبیرات بیان کردی ہیں کہ کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔

پہلی قراءۃ "كُذِّبُوا" کی توجیہ:

مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ "وَظَنُّوا" میں ضمیر کا مرجع لفظ "الرُّسُل" ہے۔ اور ظن یہاں علم اور یقین کے معنی میں ہے۔ اسی طرح "أَنَّهُمْ" اور "كُذِّبُوا" میں بھی ضمیر کا مرجع لفظ "الرُّسُلُ" ہی ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب رسولوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی امتوں نے ان کے دعوائے رسالت اور تعلیمات الٰہی کو جھٹلا دیا ہے اور وہ ان کے ایمان کی طرف سے بالکل ناامید ہو گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ان اقوام میں اب کوئی خیر باقی نہیں

---

❶ اور اس کے ضمن میں گولڈ زیہر نے لکھا ہے کہ یہ آیت بھی مفسرین کے لیے سخت حیرت پریشانی کا باعث بنی۔ مشکل اور پریشانی فعل معروف کے ساتھ "قد كذبوا" کے الفاظ میں تھی۔ جس کا معنی یہ ہے کہ رسولوں نے مایوسی کے عالم میں سمجھا کہ ان سے جھوٹ صادر ہوا ہے۔ ص: 41

رہی اور یہ ایمان لانے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہیں تو انہوں نے ان قوموں کے خلاف بددعا کی، اللہ تعالی نے اپنے رسولوں اور اہل ایمان کی مدد کی اور جھٹلانے والے عذاب الٰہی کے نتیجے میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔

یا آیت کا معنی یہ ہے کہ رسولوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی قوم نے ان کی تکذیب کر دی ہے کہ رسولوں نے کافروں پر جس عذاب اور ان کے خلاف مسلمانوں کی جس مدد کا وعدہ کیا تھا، وہ جھوٹا نکلا اور مومنوں پر عرصہ آزمائش مزید طویل ہو گیا ہے۔اس قراءۃ کی بنیاد پر لفظ 'ظن' یہاں اپنے حقیقی معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ انبیاء نے یہ گمان کیا کہ قوم کے جو لوگ ان پر ایمان لائے ہیں، وہ ان کی تکذیب کریں گے۔آیت کی یہ تفسیر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی ہے۔آپ فرماتی ہیں کہ انبیاء پر آزمائش کا عرصہ ہمیشہ دراز ہوا، جس کی وجہ سے انہیں یہ خطرہ لاحق ہوا کہ ان کے پیروکار کہیں ان کی تکذیب نہ کر دیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک اس سے مراد رسولوں کے پیروکار ہیں جو رسولوں پر ایمان لائے تھے اور ان کی تصدیق کی تھی۔ جب ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا اور اللہ کی مدد میں تاخیر ہو گئی حتی کہ رسول اپنی قوم کے ان لوگوں سے مایوس ہو گئے جنہوں نے ان کی تکذیب کی تھی تو رسولوں نے یہ گمان کر لیا کہ اب ان کے پیروکار ان کی تکذیب کریں گے تو اس وقت ہماری مدد آ گئی۔

دوسری قراءۃ "كُذِبُوا" کی توجیہات:

دوسری قراءۃ کی مفسرین نے دو توجیہات بیان کی ہیں:

پہلی توجیہ یہ کہ "وَظَنُّوا" میں ضمیر کا مرجع جھٹلانے والی قوم کو قرار دیا جائے، کیونکہ ﴿كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ میں ان کا ذکر پہلے ہے۔اور "أَنَّهُمْ" اور "كُذِبُوا" میں ضمیر کا مرجع رسولوں کو قرار دیا جائے۔اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ "قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے جو دشمنوں کے خلاف ان سے اللہ کی مدد کا وعدہ کیا تھا، وہ جھوٹا نکلا۔"

ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "البحر المحیط" میں اس قراءۃ کا یہ مفہوم ذکر کیا ہے کہ: "قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے اپنے اس دعویٰ میں ان سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ ان کے پاس اللہ کی طرف سے وحی اور مدد لے کر آئے ہیں۔ اور ان کے دشمن اگر ایمان نہ لائے تو سزا سے دوچار ہوں گے۔"

دوسری توجیہ: "وَظَنُّوا"، "أَنَّهُمْ" اور "كُذِبُوا" تینوں مقامات پر ضمیر کا مرجع جھٹلانے والی قوم کو قرار دیا جائے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ: "قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں کی طرف سے ان سے جھوٹ بولا گیا۔ رسولوں نے اپنے دعویٰ نبوت، ان کے خلاف اللہ کی مدد اور ایمان نہ لانے والوں پر عذاب کے نزول کے بارے میں ان سے جھوٹ بولا ہے۔ لہٰذا انہوں نے رسولوں کی تصدیق سے انکار کر دیا۔ ان دونوں توجیہات میں لفظ 'ظن' اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔"

تیسری قراءۃ "كَذَبُوا" کی توجیہات:

"البحر المحیط" میں ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ بیان کی ہے کہ: "قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے اللہ کے عذاب کا جو وعدہ کیا تھا، اس میں انہوں نے ان سے جھوٹ بولا۔" اور امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تاویل میں لکھتے ہیں: "جب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کرتے ہوئے قوم سے عذاب ٹال دیا تو انہوں نے گمان کیا کہ رسولوں نے ان سے اس سلسلہ میں جھوٹ بولا تھا۔ اور اس کا یہ معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ رسولوں کو یقین ہو گیا کہ قوم نے ان کی رسالت کا انکار کر کے اللہ پر جھوٹ بولا ہے۔"

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تاویل میں لکھا ہے: "ظَنُّوا" کی ضمیر امتوں کے لیے ہے جبکہ "أَنَّهُمْ قَدْ كَذَبُوا" کی ضمیر رسولوں کے لیے ہے۔ معنی یہ ہے کہ قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے ان سے مدد اور عذاب کے وعدے میں جھوٹ بولا تھا۔ اس کے برعکس یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "ظَنُّوا" کی ضمیر رسولوں کے لیے ہے۔ اور "أَنَّهُمْ قَدْ كَذَبُوا" کی ضمیر اقوام رسل کے لیے ہے۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ رسولوں نے یہ گمان کیا کہ قوم نے

ان کے ساتھ ایمان لانے کا جو وعدہ کیا تھا، اس میں انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ مذکورہ دونوں احتمالات میں 'ظن' کا لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔''

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

وهذه القراءة "كَذَبُوا" لا أستجيز القراءة بها، لإجماع الحجة من قراء الأمصار على خلافها. ولو جازت القراءة بذلك، لاحتمل وجهًا من التأويل، وهو: حتى إذا استيأس الرسل من عذاب الله قومَها المكذِّبة بها، وظنَّت الرسل أن قومها قد كَذَبوا وافتروا على الله بكفرهم بها، ويكون "الظن" موجَّهًا حينئذ إلى معنى العلم، على ما تأوَّله الحسن وقتادة.

''میں اس قراءۃ کو درست نہیں سمجھتا، کیونکہ تمام علاقوں کے وہ قراء جو فن قراءۃ میں مستند مانے جاتے ہیں، ان کا اس قراءۃ کے خلاف اجماع ہے۔ بالفرض اگر اس قراءۃ کو جائز بھی تصور کر لیا ہے تو اس کی یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ جب پیغمبر اپنی قوم پر اللہ کی طرف سے عذاب کے نزول سے مایوس ہو گئے اور رسولوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کی قوم نے اپنے کفر کے سبب اللہ کی تکذیب کی ہے اور اس پر جھوٹ باندھا ہے۔ اس صورت میں لفظ 'ظن' علم و یقین کے معنی میں ہو گا۔ امام حسن اور قتادہ نے اس کی یہی تاویل بیان کی ہے۔''

اس تفصیل کے تناظر میں یہ بات ثابت ہوتی کہ "کَذَبُوا" کی قراءۃ مفہوم کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے اور مفسرین نے اس کی ایسی شاندار تعبیر بیان کی ہے کہ دونوں متواتر قراءات کے مفہوم کے ساتھ اس کا قطعاً کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے۔ (اور گولڈ زیہر کے ذہن میں نمودار ہونے والے معنوی تصور کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔)

نیز معنوی لحاظ سے درست ہونے کے باوجود یہ قراءۃ انتہائی شاذ ہے۔ اور اس کی سب بڑی دلیل یہ ہے کہ مشہور قراء عشرۃ میں سے کسی نے بھی اس قراءۃ کو نہیں پڑھا۔ حتیٰ کہ ائمہ

عشرۃ کے بعد وہ چار قراء کہ جن کی قراءۃ کو بالاتفاق شاذ قرار دیا گیا ہے، ان میں سے بھی کسی نے اس کو نہیں پڑھا۔ اور ہم بار ہا دفعہ یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جب تک کوئی قراءۃ بذریعہ تواتر ثابت نہ ہو یا جب تک ائمہ کے ہاں شہرت کے سبب اسے قبولِ عام حاصل نہ ہو، اسے نہ تو قراءت شمار کیا جائے گا اور نہ اسے قرآن قرار دیا جائے گا۔ اور یہ قراءت بذریعہ تواتر تو درکنار بذریعہ خبرِ آحاد بھی ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ ''بلاشبہ کاف کی زبر اور ذال کی تخفیف کے ساتھ "کَذَبُوا" کی قراءۃ، یہ اصلی قراءۃ ہے۔'' محض ضد اور تعصب پر مبنی رویہ ہے، کیونکہ قراءات میں اصلی اور فرعی کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ علمائے قراءات میں سے کسی نے بھی کہیں بھی اس تقسیم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ علمائے سلف نے قراءت کی تقسیم کار کے اس اصول کو تسلیم کیا نہ متاخرین ائمہ نے اس تقسیم کو اختیار کیا ہے۔ پھر نہ معلوم گولڈ زیہر اس خود ساختہ تقسیم پر کیوں مصر ہے جبکہ اس نے اس سلسلہ میں عقل و نقل سے کوئی دلیل بھی پیش نہیں کی؟ امت مسلمہ جس اصول پر آج تک متفق چلی آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کوئی قراءت تواتر سے ثابت ہو جائے، یا بذریعہ اخبارِ آحاد ثابت ہو، لیکن قراء کے ہاں شہرت کے سبب قبولِ عام حاصل کر لے تو وہ بمنزلہ تواتر کے قطعی طور قرآن ہے، اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ بذریعہ اخبارِ آحاد نقل ہوئی ہے، البتہ قراء کے ہاں اسے قبولِ عام حاصل نہیں ہوا تو اسے قطعی طور پر شاذ قرار دے کر رد کر دیا جائے گا۔ اور اسے قطعاً قرآن نہیں سمجھا جائے گا۔ جیسا کہ قراءات عشرۃ کے علاوہ چار قراءات بالاتفاق شاذ ہیں۔ اور وہ قراءۃ جو کسی صحیح سند سے ثابت نہ ہو، جیسے "کَذَبُوا" کی یہ قراءۃ ہے تو ایسی قراءۃ کے بارے میں انتہائی شاذ اور منکر ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے مکمل طور پر رد کر دیا جائے گا اور قراءات کے ترازو میں اس کا کوئی وزن اور اعتبار نہیں ہو گا۔ گولڈ زیہر کا قراءات کو اصلی اور فرعی میں تقسیم کرنے کا یہ طرزِ عمل کسی دلیل یا دلیل نما چیز کے سہارے سے قطعاً محروم ہے۔ اور علمائے قراءت میں سے اسے کسی کی بھی تائید حاصل نہیں ہے۔

پھر آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بھی گولڈ زیہر مریضانہ ذہنیت، الحادی رجحان اور بدنیتی کا ثبوت دینے سے باز نہیں رہ سکا۔ وہ کہتا ہے کہ ''تاہم انبیاء نے یہ سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ سرزد ہو گیا ہے۔ یہ ایسی بات ہے کوئی بھی سچا مومن اس کا متحمل ہو سکتا ہے اور نہ اس کو قبول کر سکتا ہے۔''

ابھی آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس قراءۃ کی تفسیر وتاویل آیت کے سیاق کے عین مطابق ہے اور اس سے انبیاء کی عظمتِ شان بھی مجروح نہیں ہوتی۔ اگر گولڈ زیہر نیک نیتی کا مظاہرہ کرتا تو وہ اس قراءۃ کی بھی وہی تاویل کر سکتا تھا جو قراءۃ متواتر میں کی گئی ہے۔ وہاں اس نے ''ظَنُّوا'' میں ضمیر کا مرجع قوم کو قرار دیا ہے۔ اگر ''كُذِبُوا'' کی قراءۃ میں بھی ایسا ہی کیا جائے تو معنی یہ ہو گا کہ ان کی قوم نے یہ گمان کیا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹ بولا ہے۔ لیکن دل بیمار جب بے لگام خواہشات کے زیر اثر اندھا ہو جائے تو ہمیشہ دور کی ہی سوجھتی ہے۔

گولڈ زیہر کی بدنیتی اور فکر وتحقیق کے میدان میں اس کی ناپختگی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کو بطور دلیل ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بھی ''كُذِبُوا'' کی قراءۃ، جو دلیل ہے کہ ''انبیاء نے گمان کیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے۔'' کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس اشکال کو حل کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ کتب حدیث میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت عائشہ نے ''كُذِبُوا'' کی قراءۃ کو بعید خیال کرتے ہوئے ''كُذِّبُوا'' کی قراءۃ کو اس پر ترجیح دی۔ ❶

اس کے علاوہ گولڈ زیہر نے مسلم بن یسار رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو ''كُذِبُوا'' کی قراءۃ سے متعلق ذکر کر کے بددیانتی کا ایک اور ثبوت فراہم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم بن یسار نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما سے ''كُذِّبُوا'' کی قراءۃ کی تاویل کے متعلق پوچھا تھا (نہ کہ ''كُذِبُوا'' کی قراءۃ سے متعلق)، جیسا کہ کتب حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے کہ مسلم بن یسار رضی اللہ عنہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے ابو عبداللہ! قرآن کریم کی یہ

❶ ملاحظہ ہو صحیح بخاری، رقم 3389.

آیت مجھے پوری طرح پہنچ چکی ہے: ﴿حَتّٰی إِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝﴾ (110) یہ تو موت ہے کہ پیغمبر گمان کریں کہ ان سے جھوٹ بولا گیا۔ تو سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے جواب دیا: اے ابو عبد الرحمٰن، اس کا معنی یہ ہے کہ "جب رسول اپنی قوم کی طرف سے دعوتِ حق قبول کرنے سے مایوس ہو گئے اور ان کی قوم نے بھی سمجھ لیا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹ بولا تھا تو پھر اچانک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ اس قسم کے موقع پر ہمارا قانون یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں بچا لیتے ہیں اور مجرموں سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا۔" مسلم بن یسار یہ سن کر اٹھے اور سعید کو گلے لگاتے ہوئے کہا: جس طرح آپ نے میری مشکل کو حل کیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات کو آسان کر دے۔

11۔ گیارھویں مثال جو گولڈزیہر نے اس حوالہ سے پیش کی ہے، وہ سورۃ یوسف کی یہ آیت مبارکہ ہے:

﴿أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (یوسف: 12)

قراءات عشرۃ کے قراء نے "يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ" دونوں کلمات میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے دونوں کلمات کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے دونوں کو نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ گولڈزیہر نے ان میں سے لفظ "يَلْعَبْ" کو نہایت اہتمام کے ساتھ موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اور کہا ہے کہ قراء کے ہاں اسے یاء کے ساتھ پڑھنا زیادہ پسندیدہ ہے، لیکن علامہ زمخشری اور بیضاوی رحمہ اللہ کی صراحت کے مطابق اساسی اور بنیادی قراءۃ نون کے ساتھ "وَنَلْعَبْ" کی قراءۃ ہے۔ اس کے بعد گولڈزیہر نے اسی سورت کی آیت ﴿قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ﴾ سے استدلال کرتے ہوئے "وَنَلْعَبْ" کی قراءۃ کے اصلی اور بنیادی ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا ہے، اس اعتبار سے کہ لفظ "نَسْتَبِقُ" کو تمام قراء نے بالاتفاق نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے:

"تاہم اس قراءۃ کو چھوڑنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ امام طبری رحمہ اللہ، جنہوں

نے اپنی تفسیر میں یہ ذکر کیا ہے کہ نون کے ساتھ "وَنَلْعَبْ" کی قراءۃ کوفیوں کے برعکس بعض بصریوں کی قراءۃ ہے اور ابو عمرو بصری کی قراءۃ بھی یہی ہے، نے سردست ہمارے لیے یہ دری خبر محفوظ کر دی ہے کہ ابو عمرو سے کسی نے پوچھا: کہ تم "نَلْعَبْ" کیسے کہتے ہو، حالانکہ ابنائے یعقوب تو انبیاء تھے؟ تو انہوں نے کہا: وہ اس وقت انبیاء نہیں تھے۔ تو باوجود اس کے کہ زمخشری جیسے مستند اور علوم القرآن میں ممتاز مقام کے حاملین نے بصریوں کی اس قراءۃ کو اپنی تفسیر کی بنیاد بنایا ہے، اس قراءۃ کو اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ اس سے انبیاء کی اولاد، جنہیں آگے چل مقام نبوت پر فائز ہوتا تھا، کی عظمت پر حرف آتا تھا۔ اس سے تو یوں ظاہر ہوتا ہے کہ کھیل کود ہی ان کا مشغلہ تھا اور یہ چیز ظاہر ہے، ان کے اس بلند مقام نبوت سے لگا نہیں کھاتی جو ان کا مقدر بننے والا تھا۔ اور نہ ہی قرآن کریم نے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ انبیاء کی اولاد کی طرف کھیل کود کے رجحان کی نسبت کرے گا۔ لیکن جس نے اس قراءۃ کی اصلاح کی بات کی ہے، اس نے آیت: 17 کے مضمون کو کوئی اہمیت نہیں دی۔"

گولڈ زیہر کی اس طویل گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ نون کے ساتھ "نَلْعَبْ" کی قراءۃ علامہ زمخشری اور بیضاوی رحمہ اللہ کے نزدیک اساسی اور اصلی قراءۃ ہے، کیونکہ انہوں نے آیت کی تفسیر کا آغاز اسی سے کیا ہے اور آیت کی تفسیر اس قراءۃ کی بنیاد پر کرنے کے بعد یہ کہا ہے کہ ان کلمات کو یاء کے ساتھ "یرتع و یلعب" بھی پڑھا گیا ہے۔ اس سے اس نے استدلال کیا ہے کہ علامہ زمخشری اور بیضاوی رحمہ اللہ کے نزدیک اساسی قراءۃ نون کے ساتھ ہے۔ نیز اس کی نظر میں بھی نون کے ساتھ قراءۃ ہی اساسی اور اصلی قراءۃ ہے، کیونکہ یہ مابعد آیت: 17 میں لفظ "نستبق" کے ساتھ بھی مطابقت رکھتی ہے، جسے صرف نون کے ساتھ ہی پڑھا گیا ہے۔ اگرچہ یہ قراءۃ زمخشری، بیضاوی رحمہ اللہ اور خود گولڈ زیہر کی نظر میں بھی اصلی قراءۃ ہے، لیکن بعض وجوہات ایسی ہیں جو اس قراءۃ سے بے اعتنائی اور صرف نظر کا تقاضا کرتی

ہیں۔ اور وہ یہ کہ برادران یوسف علیہ السلام کی طرف کھیل کود کی نسبت ان کے اعلیٰ اور عظیم الشان منصب نبوت کے منافی ہے۔ نیز قرآن کریم کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ اولاد انبیاء کی طرف کھیل کود کے رجحان کی نسبت کرے گا، جنہیں نبوت و رسالت کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا لفظ (نَلْعَبْ) کو یاء کے ساتھ پڑھنا زیادہ درست ہے، اگرچہ یاء کے ساتھ قراءۃ لفظ "نستبق" سے لگا نہیں کھاتی۔

گولڈ زیہر کی مغالطہ آرائی اور اس کا تجزیہ:

- پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ اگر کسی قراءۃ سے آیت کی تفسیر کا آغاز کرنا مفسر کی نگاہ میں، اس قراءۃ کے اصلی اور اساسی ہونے کی دلیل بن سکتا ہے، جیسا کہ علامہ زمخشری اور بیضاوی رحمہ اللہ نے کیا ہے تو پھر متعدد ائمہ تفسیر، جیسے شیخ المفسرین امام ابن جریر طبری، علامہ قرطبی، علامہ آلوسی رحمہ اللہ اور دیگر کبار مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کا آغاز یاء کے ساتھ قراءۃ "یرتع و یلعب" سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے تو یہ دونوں قراءات اساسی اور بنیادی قرار پائیں گی۔
- دوسری اہم بات یہ ہے کہ نون کے ساتھ قراءۃ کی لفظ "نستبق" کے ساتھ مطابقت کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس بنیاد پر اسے اصلی قراءۃ قرار دے دیا جائے۔ ہاں اس مطابقت کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ نون کی قراءۃ کو یاء کی قراءۃ پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ ورنہ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ مطابقت ہی اس قراءۃ کے اصلی ہونے کا سبب ہے تو پھر اس سے بھی مضبوط سبب جو یاء کے ساتھ قراءۃ کے اصلی ہونے کا مقتضی ہے، ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> "ان دونوں قراءات میں سے زیادہ درست میرے نزدیک ان کی قراءت ہے جنہوں نے دونوں کلمات کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لیے کہ برادران یوسف نے باپ سے یوسف کو اپنے ساتھ بھیجنے کی درخواست کی تھی اور باپ کو یوسف کے بارے میں یہ کہہ کر دھوکا دیا تھا کہ یوسف کا ان کے ساتھ جانا، کھلے میدانوں

کی سیر کرنا اور وہاں کھیل کود سے لطف اندوز ہونا اس کے لیے تفریح اور خوشی کا باعث ہوگا، تاکہ وہ یوسف کو ان کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہوسکیں۔ اپنے بارے میں یہ کہہ کر وہ باپ کو دھوکا نہیں دے سکتے تھے۔ بھائیوں کی اس گفتگو کا مقصد یوسف کو اپنے ساتھ لے جانے کا جواز پیش کرنا تھا کہ ساتھ جانے میں اس کا ہی فائدہ ہے کہ وہاں یہ اپنی مرضی سے کھلی فضا، تر و تازہ پھلوں اور خشک میوہ جات سے لطف اندوز ہوگا۔"

تو اگر مطابقت ہی نون کی قراءۃ کے بنیادی ہونے کی متقضی ہو سکتی ہے تو یہ مضبوط سبب جو ہم نے ذکر کیا ہے، کیا متقضی نہیں ہو سکتا کہ یاء کے ساتھ قراءۃ کو اصلی قرار دیا جائے؟ لیکن ہم گزشتہ سطور میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ قراءات میں اصلی اور فرعی کی قطعاً کوئی تقسیم نہیں ہے۔ اگر کوئی قراءۃ بذریعہ تواتر ثابت ہے یا بذریعہ اخبار آحاد، اور قراء کے ہاں قبول عام کا مقام حاصل کر چکی ہے تو اسے قبول کیا جائے گا، ورنہ رد کر دی جائے گی۔

- گولڈ زیہر یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ "اگرچہ میرے نزدیک اور زمخشری جیسے ثقہ اور علوم القرآن میں ممتاز مقام کے حاملین کی نظر میں نون کے ساتھ قراءۃ اساسی اور اصلی قراءۃ ہے، لیکن یہ قراءۃ اس لیے نظر انداز کر دی گئی کہ اس میں برادران یوسف علیہ السلام کی طرف کھیل کود کی نسبت کی گئی ہے جو اولاد انبیاء کی تعظیم کے منافی ہے۔ نیز قرآن کریم کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اولاد انبیاء کی عظمت کے پیش نظر ان کی طرف کھیل کود کے رجحان کی نسبت کرے۔"

لیکن حیرت ہے گولڈ زیہر کی عقل پر کہ جو قرآن اس کی نگاہ میں برادران یوسف کی طرف کھیل کود کی نسبت نہیں کر سکتا، وہی قرآن برادران یوسف کو انتہائی بھیانک جرائم کا مرتکب قرار دے رہا ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت ملاحظہ فرمایئے:

﴿إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ۝ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَٰلِحِينَ ۝ قَالَ

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِىْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۝﴾ (یوسف : 8-10)

''سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ چلو یوسف کو قتل کر دو یا کسی علاقہ میں پھینک دو، تا کہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری طرف ہی ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن جانا۔ اس پر ان میں سے ایک کہنے لگا: یوسف کو قتل نہ کرو، بلکہ اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو، کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔''

غور کیجئے! قرآن کریم نے پہلے انہیں یوسف اور اس کے بھائی کے خلاف حسد و رقابت کا مرتکب قرار دیا۔ پھر بتایا کہ انہوں نے اپنے باپ جو اللہ کے پیغمبر بھی ہیں، کو واضح گمراہی سے متہم کیا۔ اس کے بعد قرآن نے انہیں اپنے بھائی کے قتل کی سازش کا ذمہ دار قرار دیا اور ان کی طرف ایک معصوم بچے کے قتل جیسے انتہائی گھناؤنے جرم کی نسبت کی، جس کا گناہ صرف یہ تھا کہ باپ کے دل میں اس کی محبت گھر کر گئی تھی۔ اور یہ بچہ بھی کوئی اجنبی نہیں تھا، بلکہ ان کا بھائی تھا۔ وہ سب ایک ہی باپ کی اولاد تھے۔ حالانکہ قتل، شرک کے بعد سب سے بڑا جرم ہے۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے باہم مشورہ کیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا جنگل میں پھینک دیا جائے کہ درندے انہیں پھاڑ کھائیں۔ اور ایک بھائی جو سب سے زیادہ نرم دل تھا، نے مشورہ دیا کہ اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دیا جائے کہ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔

اس کے بعد قرآن کریم نے برادران یوسف کو مکر و فریب، دھوکے، فراڈ اور ڈرامہ رچانے کا مرتکب قرار دیا ہے اور ان کی طرف انتہائی قبیح جھوٹ کی نسبت کی ہے۔ قرآن کریم کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

﴿وَ جَآءُوْ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ۝ قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا

صٰدِقِیْنَ ○ وَجَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ﴾ (یوسف: 16-17)

''شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا: ابا جان! ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا، بھیڑیا آیا اور اسے کھا گیا اور آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے، خواہ ہم سچے ہوں اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر لے آئے تھے۔''

لخت جگر کی ہلاکت کی خبر دیتے ہوئے، انہوں نے اپنے باپ کے بڑھاپے پر بھی رحم نہ کھایا۔ اور حکمت و دانش کی تمام حدوں کو پامال کرتے ہوئے انہوں نے انسانیت اور رحم و کرم کی تمام رسیاں کاٹ ڈالیں اور اخوت و محبت کے مفاہیم روند ڈالے۔

غور کیجئے! اگر قرآن کریم برادران یوسف کو حسد و کینہ، بھائی کے قتل کی سازش، مکر و فریب، فراڈ، حقائق پر پردہ ڈالنے، کذب بیانی قرابت داری کی جڑیں کاٹنے، مہر و محبت کی روح کو قتل کرنے جیسے انسانیت سوز جرائم کا مرتکب قرار دے کر ان تمام جرائم کی الزامی فہرست پیش کر سکتا ہے تو وہ ان کی طرف کھیل کی طرف رجحان کی نسبت کیوں نہیں کر سکتا؟ گولڈ زیہر کی اس عجیب و غریب تخمین سازی پر عقل حیران ہے۔ اور مزید حیران کن امر یہ ہے کہ جن علماء کو گولڈ زیہر نے ثقاہت اور علوم القرآن میں مہارت کی سند عطا کی ہے، جیسے زمخشری اور امام بیضاوی رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین، انہوں نے بھی اس میں آیت میں لعب (کھیل) کی تفسیر دوڑ اور تیر اندازی میں مقابلہ سے کی ہے، جس کی دلیل برادران یوسف کا یہ قول ہے: ﴿اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ﴾ کہ ''ہم دوڑ کے مقابلے میں لگے ہوئے تھے۔''

اس سے مراد کھیل تماشا نہیں ہے، وگرنہ یعقوب علیہ السلام بھی اس پر رضامندی کا اظہار نہ کرتے۔ نیز جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ برادران یوسف کو بعد میں مقام نبوت پر فائز نہیں کیا گیا تھا۔ اور محض ان کا نبی کی اولاد ہونا ان جرائم کے ارتکاب سے مانع نہیں جن کی الزامی فہرست قرآن کریم نے پیش کی ہے۔ اور اس پر نوح علیہ السلام کے بیٹے کی مثال ہمارے لیے کافی دلیل ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ یہ دونوں قراءات متواتر ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اساسی اور غیر اساسی یا اصلی یا فرعی نہیں ہے۔ اور یہ دونوں قراءات مفہوم کے اعتبار سے آیات کے سیاق وسباق کے مطابق ہیں۔

12۔ بارھویں مثال جو گولڈ زیہر نے اس حوالہ سے پیش کی ہے، وہ سورۃ یوسف کی آیت نمبر 81 ہے۔ اس آیت کے ضمن میں گولڈ زیہر لکھتا ہے:

''اسی طرح یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ قرآنی متن میں قراء کی اصلاح نے یعقوب علیہ السلام کے ایک بیٹے کی ساکھ کو نقصان سے بچا لیا۔ سورۃ یوسف کی آیت 81 میں ہے کہ یوسف نے اپنے بھائی بنیامین کے سامان سے وہ پیالہ برآمد کر لیا جو انہوں نے خود ہی بنیامین کو مصر میں روک رکھنے کے لیے بطور تدبیر ان کے سامان میں رکھا تھا۔ جب یہ واقعہ رونما ہو چکا تو برادران یوسف نے اپنے باپ کو واپس جا کر یہ رپورٹ دی: ﴿إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ﴾ (81) ''ابا جان! آپ کے صاحبزادے نے چوری کا ارتکاب کیا ہے۔'' اس قراءۃ کی بنیاد پر چونکہ بنیامین کے جرم کا اقرار لازم آتا تھا تو امام کسائی کی قراءۃ نے اس دھبے کو یوں مٹا دیا: ﴿إِنَّ ابْنَكَ سُرِّقَ﴾ سین کی پیش اور راء کی زیر اور تشدید کے ساتھ اس قراءۃ کا معنی یہ ہے کہ آپ کے بیٹے پر چوری کا الزام ہے۔ اس قراءۃ کو ابو الخطاب الجراح نے رمضان کی ایک رات قیام میں پڑھا۔ خلیفہ مستنصر بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا تھا۔ خلیفہ جو دینی مسائل کو بڑی اہمیت دیتا تھا، نے نماز کے بعد اس قراءۃ کو بڑا پسند کیا اور کہا: یہ قراءۃ اولاد انبیاء کو کذب بیانی کے داغ ❶ سے مبرا قرار دیتی ہے۔''

---

❶ اس میں کوئی جھوٹ کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے بنیامین کے سامان سے پیالہ برآمد ہوتے دیکھا تھا لہٰذا اس کی صراحت کر دی، اور ساتھ یہ بھی کہا کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہوا، بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں، باقی غیب اللہ بہتر جانتا ہے۔ کوئی بھی ذی عقل اسے کذب بیانی سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خود ساختہ ہے۔ لیکن گولڈ زیہر کو تو اپنے ذہن ساز مطروف کے لئے بس سہارا چاہیے۔

گولڈ زیہر کے تخیلات کا جائزہ:

گولڈ زیہر کے اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سین کی زبر اور راء کی تخفیف کے ساتھ "سَرَقَ" کی قراءۃ غلطی تھی اور سین کی پیش اور راء کی زیر اور تشدید کے ساتھ "سُرِّقَ" کی قراءت درست قراءۃ ہے، کیونکہ اول الذکر قراءۃ بنیامین کو پیغمبر کا بیٹا ہونے کے باوجود چوری کے جرم سے متصف قرار دیتی ہے۔ اور ثانی الذکر قراءۃ چوری کے جرم سے بنیامین کی لاج رکھتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ ان پر چوری کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ اور الزام سے یہ لازم نہیں آتا کہ انہوں نے واقعی چوری کا ارتکاب کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ گولڈ زیہر کی یہ سخن سازی بالکل غلط اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ "سَرَقَ" کی قراءت ہی متواتر قراءۃ ہے، جس پر قرائے عشرۃ کے علاوہ قراءات شاذۃ کے چار قراء بھی متفق ہیں۔ اور ان میں امام کسائی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ باقی یہ روایت کہ امام کسائی رحمہ اللہ نے اسے "سُرِّقَ" پڑھا ہے، انتہائی شاذ اور خود ساختہ روایت ہے۔ اس کا تواتر یا خبر واحد سے ثابت ہونا تو درکنار کسی قاری کی طرف اس کی نسبت تک نہیں ہے۔ حتی کہ علامہ ابوالفتح ابن جنی رحمہ اللہ جنہوں نے اپنی کتاب "المحتسب" میں جملہ قراءات شاذۃ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اس قراءۃ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ اور علمائے قراءات کے ہاں قطعاً اس قراءۃ کو کوئی وقعت حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جس قراءۃ کو امت نے صدیوں کے تاریخی تسلسل میں آج تک قراءۃ تسلیم نہیں کیا، گولڈ زیہر کا اس قراءۃ کو صحیح باور کروانا تاریخی حقائق کے ساتھ کھلا مذاق اور اس کی بددیانتی کا واضح مظہر ہے۔

دیکھئے: اول الذکر قراءۃ بنیامین کو چوری کے جرم سے متصف قرار دیتی ہے، کیونکہ بھائیوں نے بنیامین کے سامان سے پیالہ برآمد ہوتے دیکھ لیا تھا اور انہیں یہ علم نہیں تھا کہ پیالہ جان بوجھ کر سامان میں چھپایا گیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے کہا: ﴿وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا﴾ یعنی "ہم نے اسے چوری کرتے نہیں دیکھا، اس کے سامان سے پیالہ کی برآمدگی

دیکھی ہے، اس بنیاد پر ہم اس کی چوری کی گواہی دے رہے ہیں۔" ﴿وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِينَ﴾ یعنی" باقی غیب کی نگہبانی تو ہم کر نہ سکتے تھے۔یعنی جب ہم نے آپ سے عہد و پیمان کیا تھا، اس وقت ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا چوری کرے گا۔اور نبی کا بیٹا ہونا اس جرم کے سامنے روک نہ بن سکے گا۔" اس سارے سیاق و سباق سے بھی قراءۃ متواترہ کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے واقعی بنیامین کو چوری کا مرتکب قرار دیا تھا۔اسی لیے انہوں نے ﴿وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا﴾ کے الفاظ کو اپنے دعویٰ کے اوپر بطور دلیل پیش کیا۔اگر ثانی الذکر قراءۃ کو تسلیم کیا جائے تو پھر ﴿وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا﴾ اور ﴿وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِينَ﴾ کے ساتھ ثبوت پیش کرنے کی کوئی وجہ اور ضرورت نظر نہیں آتی، کیونکہ محض الزام کسی دلیل و ثبوت کا محتاج نہیں ہوتا۔اگر برادران بنیامین باپ سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ آپ کے بیٹے پر محض جھوٹ کا الزام ہے تو اس پر باپ کو بیٹوں سے ثبوت طلب کرنے اوران کی طرف سے ثبوت پیش کرنے کی قطعاً کوئی وجہ نہیں تھی۔برادران کی طرف سے پوری وضاحت کے ساتھ ثبوت پیش کرنے کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ بنیامین کو واقعی چوری کا مرتکب سمجھتے تھے۔لہٰذا ثابت ہوا کہ آیات کے سیاق و سباق کے اعتبار سے بھی اول الذکر قراءۃ ہی درست ہے۔

نیز گولڈ زیہر کی روایت کے مطابق خلیفہ مستنصر کا اس قراءۃ کو پسند کرنا اور اس کے حق میں یہ الفاظ کہنا کہ" یہ قراءت اولاد انبیاء کو کذب بیانی کے داغ سے مبرا قرار دیتی ہے۔" ہمیں اس روایت کے ثبوت میں شک ہے۔اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ثقہ اور مستند عالم نے اس روایت کو بیان نہیں کیا۔دوسری وجہ یہ کہ اس میں خلیفہ کے یہ الفاظ کہ" یہ قراءۃ اولاد انبیاء کو کذب بیانی کے داغ سے مبرا قرار دیتی ہے" اس روایت کو مشکوک بنا رہے ہیں۔یہ الفاظ واقعہ کے مطابق نہیں ہیں۔ بظاہر خلیفہ کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ یہ قراءۃ اولاد انبیاء کو چوری کے داغ سے مبرا قرار دیتی ہے۔کیونکہ اول الذکر قراءۃ میں بنیامین کی طرف چوری کی نسبت کی گئی ہے، اس میں بھائیوں کے بارے میں کذب بیانی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

13۔ تیرھویں مثال اس سلسلہ میں گولڈ زیہر نے سورۃ التوبہ کی یہ آیت پیش کی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

اس کے ضمن میں گولڈ زیہر نے اپنی کتاب کے صفحہ 45 پر لکھا ہے:

''سچ کی ترغیب کے متعلق یہ عبارت بعض احتیاط پسند لوگوں کے نزدیک جامع اور اپنے مفہوم میں فیصلہ کن نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان سچے لوگوں کے ساتھ تو ہوتا ہے، لیکن ان میں سے نہیں ہوتا۔ لہٰذا انہوں نے ﴿وَكُونُوا مِنَ الصَّادِقِينَ﴾ کی قراءۃ کو ترجیح دی ہے۔''

گولڈ زیہر کے استدلال کا تجزیہ:

❀ گولڈ زیہر کا یہ استدلال مغالطہ انگیز اور فریب دہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ (مع) ایک جگہ جمع ہونے اور ساتھی بنانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں مرد لوگوں کو بنفس نفیس کسی وقت میں یا کسی جگہ میں جمع ہونے کا حکم نہیں ہے، بلکہ اوصاف و کردار میں ساتھی بننے اور شریک کار ہونے کا حکم ہے۔ چنانچہ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ سچے لوگوں کے ساتھی بنو اور ان کا ساتھ دو جنہوں نے اپنے مقاصد، اقوال، اعمال میں ہمیشہ اللہ سے سچ بولا۔ ان کی سیرت اور کردار اپناؤ، ان کے نقش قدم پر چلو اور ان کے منہج زندگی کو اختیار کرو۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان جب کسی گروہ کا ہم رکاب ہوتا ہے، ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے، پسند و ناپسند میں ان کی اتباع کرتا ہے تو رفتہ رفتہ ان کے اخلاق اور اوصاف اس کی طرف منتقل اور اس کے شعور و احساسات میں سرایت کر جاتے ہیں اور ان کی عادات و اطوار اس کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اور بالآخر وہ بھی ان کے ساتھ سچ کا ایک نمونہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے اردگرد ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ طبیعتیں ہمیشہ طبیعتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے "من" اور "مع" کی تعبیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

* اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے احکام کی تعمیل کرو، فرائض کو ادا کرو، ممنوعات سے بچو، حدود الٰہی سے تجاوز نہ کرو اور جنت میں ان لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ جن کے اعمال اور عزائم سچے ثابت ہوئے ہیں۔ تو ﴿وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ کا عطف ماقبل پر مسبب کا سبب پر عطف یا لازم کا ملزوم پر عطف کے قبیل سے ہے۔ اور سورۃ النساء میں فرمان الٰہی: ﴿وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾ (69) ٹھیک ٹھیک یہی معنی دے رہا ہے۔ تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ دنیا میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو جنت میں سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ گے۔
* تیسری اہم بات یہ ہے کہ یہ قراءۃ انتہائی غریب، بلکہ خود ساختہ ہے۔ قرائے عشرۃ تو درکنار قراءات شاذہ کے چار قراء میں سے کسی نے بھی اس قراءۃ کو نہیں پڑھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ قراءۃ تمام مصاحف عثمانیہ کے خلاف ہے۔ اور پوری امت مسلمہ اس بات پر متفق ہے کہ ہر وہ قراءۃ جو مصاحف عثمانیہ کے خلاف ہو، قرآن نہیں ہو سکتی اور نہ ہی نماز اور نماز کے علاوہ اس کی تلاوت جائز ہے۔

14۔ گولڈ زیہر نے اپنی کتاب کے صفحہ 46، 47 پر یہ ذکر کیا ہے کہ

> ”قرآن میں ایسی نصوص بھی موجود ہیں، جن کو قبول عام حاصل ہے، لیکن در حقیقت وہ نقل کرنے والوں کی لاپرواہی، سہو اور غفلت کا نتیجہ ہیں۔ دور اول کے علماء نے ان نصوص کی اصلاح کی کوشش نہیں کی، بلکہ پوری سچائی اور دیانت کے ساتھ ان کو باقی رکھنے کو ترجیح دی۔“

اس کے بعد اس نے بطور استدلال کچھ روایات پیش کی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ

> ”زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے ابان بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے سورۃ النساء کی آیت ﴿لَٰكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ

إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ٥﴾ کے متعلق پوچھا کہ اس میں لفظ "الْمُقِيمِينَ" جو کہ معطوف بن رہا ہے اپنے معطوف علیہ کے مطابق نہیں ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔ اسی طرح عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ انہوں نے مذکورہ بالا مقام کے متعلق اپنی خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا یہ کاتبوں کی غلطی ہے، کاتبوں نے یہاں لکھنے میں غلطی کی ہے۔ اسی طرح سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ سورۃ النور کی آیت:27 میں ﴿حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا﴾ لکھنے والوں کی غلطی ہے، اور انہوں نے اسے "حتی تستأذنوا" پڑھا ہے۔"

گولڈ زیہر کی خیال آرائی کا جائزہ:

گولڈ زیہر نے جو روایات اپنے زعم میں بطور دلیل پیش کی ہیں، یہ تمام تر سراسر باطل اور قابل رد ہیں، امت مسلمہ میں سے کسی نے بھی ان کو پر کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں دی اور تواترِ مصحف کے مقابلے میں ان کا کوئی اعتبار اور وزن ہے، نہ یہ ان روایات کے مقابلے میں کھڑی ہونے کے قابل ہیں، جن پر پوری امت مسلمہ ہمیشہ سے متفق رہی ہے۔ کوئی بھی انصاف پسند محقق ان بیہودہ اور باطل روایات کو ان روایات کے مقابلے میں پیش کرنے کی جرأت نہیں کرے گا جو زمانہ نبوت سے نسل در نسل ہم تک پہنچی ہیں، کیونکہ قطعی اور متواتر چیز کے ساتھ معارضہ اور تقابل نا انصافی ہے۔

بعض علماء نے ان بے بنیاد روایات کو بغیر کسی تحقیق وتمحیص کے محض ریکارڈ کے طور پر اپنی کتب میں ذکر کیا، لیکن اسلام دشمن عناصر اور مستشرقین نے انہیں اسلام اور قرآن کے خلاف طعن وتشنیع کا ذریعہ بنا لیا اور کتاب اللہ پر مسلمانوں کے اعتماد کی توہین کے درپے ہو گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے سے مصاحف کی کتابت کا حکم دیا۔ کتابت مکمل ہو گئی، ان مصاحف کی تعداد ایک روایت کے مطابق چھ اور ایک روایت کے مطابق آٹھ تھی۔ تدوین کے بعد آپ نے ان تمام مصاحف کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش کیا۔انہوں نے اس کے ایک ایک حرف سے اتفاق کیا۔اور تمام مصاحف عثمانیہ ﴿وَالْمُقِيمِينَ﴾ اور ﴿حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا﴾ پر متفق تھے۔ کیا کوئی ذی ہوش انسان اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتاب اللہ میں کوئی غلطی یا تصحیف دیکھیں اور پھر اسے بغیر اصلاح اور درستگی کے ویسے ہی چھوڑ دیں؟ حالانکہ قرآن کریم سے زیادہ مقدس چیز ان کی نگاہ میں کوئی نہیں تھی۔

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے ایسی تمام روایات کو من گھڑت اور خود ساختہ قرار دیا ہے اور نصب کے ساتھ "وَالْمُقِيمِينَ" کی قراءۃ کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''کوفہ اور بصرہ کے بعض علماء نے کہا ہے کہ ﴿وَالْمُقِيمِينَ الصلوة﴾ درحقیقت ﴿الراسخون فی العلم﴾ کی صفت ہے،لیکن سلسلہ کلام جب طویل ہوا اور "الراسخون فی العلم" اور ﴿وَالْمُقِيمِينَ الصلوة﴾ کے درمیان دوسری کلام حائل ہو گئی تو بطور مدح "وَالْمُقِيمِينَ" کو نصب دے دی گئی۔ اور ایک ہی چیز کی صفت کے بارے میں عرب یہ اسلوب بھی اختیار کرتے ہیں کہ مدح و ذم (تعریف و مذمت) کے پیرائے میں جب سلسلہ کلام طویل ہو جائے تو اہل عرب بعض دفعہ آغاز کلام اور درمیان کلام کے اعراب میں فرق کرتے ہیں اور پھر کلام کے آخر میں وہی اعراب دیتے ہیں جو کلام کے شروع میں دیا گیا تھا۔اور بعض دفعہ کلام کے آخر کا اعراب درمیان کلام کے مطابق رکھتے ہیں۔اور بعض دفعہ پورے سلسلہ کلام میں ایک ہی طرح کا اعراب رکھتے ہیں۔ کوفہ اور بصرہ کے ان علماء نے اپنے اس اصول پر قرآن کریم کی اس آیت سے استشہاد کیا ہے: ﴿وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ (البقرة: 177)

اس کے بعد امام طبری رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے کہ

''اگر لفظ ''وَالْمُقِيمِينَ'' ازروئے رسم الخط غلط ہوتا تو اصحاب رسول ﷺ کبھی بھی مسلمانوں کو اس لحن کے مطابق قرآن کی تعلیم نہ دیتے ،بلکہ تعلیم و تعلم اور زبانی طور پر ضرور اس کی اصلاح کر لیتے۔ پوری ملت اسلامیہ کا اس کی قراءت کو رسم کے مطابق آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا اس کی صحت کا واضح ثبوت ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ اس میں کاتب کی غلطی کا کوئی دخل نہیں ہے۔''

علامہ زمخشری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الکشاف میں مذکورہ آیت میں نصب کی قراءۃ کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہاں ''المقیمین'' کو اس لیے نصب دی گئی ہے کہ نماز کی فضیلت کو اجاگر کیا سکے۔ اس کا دائرہ خاصا وسیع ہے اور سیبویہ نے اس حوالہ سے متعدد مثالیں اور شواہد پیش کئے ہیں۔ لہذا جس نے یہاں رسم مصحف میں لحن کا دعویٰ کیا ہے، اس کی بات ناقابل التفات ہے۔ اس کی طرف وہی شخص دھیان دے سکتا ہے کہ جس نے سیبویہ کی ''الکتاب'' نہیں دیکھی یا وہ مذاہب عرب سے ناواقف ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ اختصاص کی بناء پر نصب دینے سے اسلوب کلام میں کس قدر تفنن اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ شخص بے خبر ہے کہ اولین و سابقین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ،جن کے تذکرے رب کائنات نے تورات و انجیل میں کیے اور کوئی شخص دین کے دفاع میں ان سے بڑھ کر حساس اور غیرت مند نہیں ہو سکتا۔ ایسی پاکباز ہستیوں کے بارے یہ تصور بھی محال ہے کہ وہ کتاب میں کوئی ایسا خلاء چھوڑ دیتے کہ بعد میں آنے والے اسے پر کرتے۔''

انہوں نے مزید یہ لکھا ہے کہ

''ہم اللہ کی کتاب کہ باطل اس کے آگے سے راہ پا سکتا ہے نہ پیچھے سے، کے متعلق ایسی کسی بات کو ہرگز سچ نہیں مان سکتے۔ اس قسم کی غلطی مصحفِ امام میں کیسے مخفی رہ سکتی تھی، حالانکہ وہ ان جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں میں گردش کر رہا تھا جو اللہ کے دین میں انتہائی محتاط، اس کے نگہبان اور اس کے اہم یا باریک قانونی مسائل میں کسی غفلت کے روادار نہیں ہو سکتے تھے۔ قرآن کریم جو ان کے آئین وقانون کی اصل بنیاد تھا، اس کے بغیر ان کے دین کی پوری عمارت پیوند خاک ہو جاتی، اس کے متعلق ایسی کوتاہی کے وہ مرتکب کیسے ہو سکتے تھے؟ اللہ کی قسم! یہ انتہائی تلخ جھوٹ ہے جو کتاب اللہ کے بارے میں بولا گیا ہے۔''

اور امام قشیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''کتاب اللہ میں لحن کا دعوی سراسر باطل ہے۔ اس لیے کہ جن حضرات نے قرآن کریم کو جمع کیا تھا، وہ لغت کے امام تھے۔ ان کے متعلق قرآن میں دسیسہ کاری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ نے سورۃ النور کی اس آیت کے متعلق لکھا ہے:

''ابن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض لوگوں کے بقول سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ "حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا" کاتب کی غلطی یا اس کا وہم ہے، یہ اصل میں "حَتّٰى تَسْتَأْذِنُوا" تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ و دیگر کی طرف یہ روایت غلط منسوب ہے، کیونکہ تمام مصاحفِ اسلام میں (حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا) کے الفاظ ثبت ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے لے کر اب تک اسی پر امت کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ ایسا لفظ جس پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو، اس کو کاتب کا وہم یا اس کی غلطی قرار دینا ابن عباس رضی اللہ عنہ پر صاف بہتان ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ

وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝﴾ یعنی" باطل اس کے آگے سے راہ پاسکتا ہے نہ پیچھے سے، کیونکہ یہ حکیم وحمید ذات کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔" اور ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ یعنی" ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔"

نیز ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کی طرف اس روایت کے غلط منسوب ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ کلام عرب میں لفظ "تَسْتَأْنِسُوا" کا مفہوم اور توجیہ بالکل واضح ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر کھڑے ہو کر ان الفاظ میں اجازت طلب کی: ((أَسْتَأْنِسُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ)) ❶ "اے اللہ کے رسول! کیا مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ "إستأنس" عربی زبان میں "إستأذن" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھلا کیسے غلط قرار دے سکتے تھے؟

نیز اس روایت کے خود ساختہ ہونے کی ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ ابن ابی حاتم، ابن الانباری، ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے "تَسْتَأْنِسُوا" کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: "صاحب خانہ میں سے جو اجازت دینے کا مجاز ہو، اس سے اجازت طلب کرلو۔"

ان دلائل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے "تَسْتَأْذِنُوا" کو بطور تفسیر ذکر کیا ہے بطور قراءت ذکر نہیں کیا۔ ہم اس بحث کا اختتام ابو بکر محمد بن بشار الانباری رحمہ اللہ کے اس حوالے سے نہایت موزوں اقتباس سے کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اہل فضل ودانش ہمیشہ سے حق وانصاف کے مطابق قرآن کریم کے شرف اور اس کے عظیم الشان مقام کا اعتراف کرتے رہے اور ملحدین کی دسیسہ کاریوں، گمراہوں کی تلبیسات اور اہل باطل کی تحریفات کو بے نقاب کرتے رہے ہیں۔

❶ صحیح بخاری: 2468

یہاں تک کہ ایک مرد گمراہ ظاہر ہوا جو ملت کے رستہ سے ہٹ کر اپنے ناروا حملوں سے اس شریعت مطہرہ کو مسموم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس ملت کا حامی و ناصر خود اللہ جل شانہ ہے اور وہ ہمیشہ سے اس دین حنیف کی بنیادوں کو استوار اور اس کی شاخوں کو ثمر بار رکھے گا۔ اور اہل ستم کی کارستانیوں اور دشمنوں کی فریب کاریوں سے اس کی حفاظت کرے گا۔ اس مرد گمراہ نے دعویٰ کیا ہے کہ جو مصحف اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے، اس میں بعض حروف تبدیل شدہ ہیں۔ اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں بھی مصحف عثمان کی مخالفت کروں۔''

واضح ہوا کہ جنہیں گولڈ زیہر نے اپنے خیال خام سے سلف قرار دیا ہے، وہ درحقیقت ناخلف ہیں۔

گولڈ زیہر کی کذب بیانی اور اس کا تجزیہ:

گولڈ زیہر نے اپنی کتاب کے صفحہ 48 پر لکھا ہے:

''ہر انسان کو معنی کی رعایت کرتے ہوئے قرآنی نص میں مترادف الفاظ کے استعمال کی کھلی آزادی حاصل تھی۔ نص قرآنی کی روایت میں اصلی متن کے ساتھ کلی مطابقت ضروری نہیں تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک آیت کو پڑھتے ہوئے بعض الفاظ کا اضافہ کیا جو مصحف عثمانی میں موجود نہیں ہیں، حالانکہ مصحف عثمانی ان کے اپنے حکم سے مدون ہوا اور انہیں اس پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ سورۃ آل عمران کی آیت 104 کو انہوں یوں پڑھا ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ "و يستعينون الله على ما أصابهم" یہاں "و يستعينون الله على ما أصابهم" کا اضافہ مصحف عثمانی میں موجود نہیں ہے۔''

تجزیہ:

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے کسی دور میں بھی ایسی کسی آزادی کا کوئی وجود نہیں رہا، سوائے چند لوگوں کے جنہوں نے اس شاذ نقطہ نظر کو اختیار کیا تو پوری امت مسلمہ ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور انتہائی سختی اور دلائل کے ساتھ ان لوگوں کا رد کیا۔ بالآخر وہ اپنی اس رائے دستبردار ہو گئے اور اس نقطہ نظر سے توبہ کر لی۔ علماء اور قراء کے ایک جم غفیر کے سامنے ان کی توبہ کی دستاویز لکھی گئی، جس پر ان کے دستخط لیے گئے۔ ان میں ایک ابن شنبوذ (م ۳۲۸ھ) اور دوسرا ابو بکر العطار (م ۳۵۴ھ) تھا۔ ہاں البتہ یہ آزادی ہر قاری کو حاصل ہے اور ہمیشہ حاصل رہے گی کہ وہ نقل واثر کے دائرہ میں ہر اس قراءۃ کو اختیار کر سکتا ہے جو تواتر سے ثابت ہے، اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی خاص قراءت یا روایت کا التزام کرے۔

اور جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب "و یستعینون اللہ علی ما أصابھم" کی قراءۃ کا تعلق ہے تو اگر یہ روایت ان سے صحیح ثابت ہے تو دو حال سے خالی نہیں۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ قراءۃ مصاحف عثمانیہ کی تدوین سے قبل بیان کی تھی تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ ان قراءات میں سے ہے جو پہلے نازل ہوئی تھیں اور پھر عرضہ اخیرہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا آخری دور) کے وقت منسوخ ہو گئیں تھیں اور شاید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کے نسخ کا علم نہ ہو سکا اور وہ اس کی قراءت کرتے رہے، جس طرح کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس طرح کی قراءات کی تلاوت کرتے رہے جن کی قراءت پہلے جائز تھی، پھر عرضہ اخیرہ کے وقت منسوخ ہو گئی، لیکن انہیں ان کے نسخ کا علم نہ ہو سکا۔ قراءات کی یہی وہ قسم تھی جو اہل شام اور اہل عراق کے درمیان اختلاف اور نزاع کا باعث ہوئی تھی اور یہی قراءات مصاحف عثمانیہ کی تدوین کا محرک بنی تھیں۔ اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی تدوین کے بعد اسے پڑھا ہے تو پھر اس کی کوئی توجیہ سوائے اس کے ممکن نہیں کہ انہوں نے یہ الفاظ آیت کی تفسیر میں پڑھے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد اس

حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ جس شخص نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بیڑا اٹھایا، اسے اذیتوں سے دو چار ہونا پڑا، لہٰذا اسے چاہیے کہ ان تکالیف پر صبر کرے اور اللہ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اسے ان اذیتوں کو برداشت کرنے کی توفیق دے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مفہوم سورۃ لقمان کی اس آیت سے اخذ کیا تھا: ﴿يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝﴾ (لقمان: 17)

ان کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا کہ یہ اضافی الفاظ بھی آیت کا حصہ ہیں۔ کیا کوئی عقل مند یہ تصور کر سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مصاحف عثمانیہ کے علاوہ تمام مصاحف کو نذر آتش کرنے کا حکم دیں اور پھر خود ہی ایک ایسی قراءت کو اختیار کریں جو مصاحف عثمانیہ کے صریح خلاف ہے؟ کیا کوئی ہوش مند یہ مان سکتا ہے کہ آپ امت مسلمہ کو تو رسم مصحف کا پابند کریں، لیکن خود اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی کریں؟ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ قراءۃ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف بھی منسوب ہے۔ اس کے بعد انہوں نے امام ابن الانباری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

> ''یہ اضافہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے تفسیر ہے اور ان کا اپنا کلام ہے، جسے بعض غیر ذمہ دار ناقلین نے غلط فہمی سے قرآن کے ساتھ ملا دیا...... کوئی بھی ذی ہوش انسان اس میں ذرا شک نہیں کرے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس اضافہ کو قرآن نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ انہوں نے اسے مصحف میں نہیں لکھوایا تھا، حالانکہ آپ اس وقت عالم اسلام کے واحد حکمران اور امام تھے۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ اس اضافہ کو قرآن کا حصہ سمجھتے ہوتے تو اسے مصاحف میں ضرور لکھواتے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اس اضافہ کو محض وعظ ونصیحت اور پروردگار عالم کے ماقبل کلام کی تاکید اور تفسیر کے لیے ذکر کیا ہے۔''

بہر حال مصاحف عثمانیہ میں اس قراءۃ کا کوئی وجود نہیں ہے اور ہم بار ہا دفعہ یہ واضح کر

چکے ہیں کہ جو قراءۃ بھی رسمِ مصحف کے خلاف ہوگی، رد کر دی جائے گی، وہ قطعاً قرآن نہیں ہے، اسی پر پوری امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

گولڈ زیہر کی ایک اور خیال آرائی اور اس کا تجزیہ

گولڈ زیہر نے اپنی کتاب کے صفحہ 49 پر لکھا ہے:

''اسی طرح جمع قرآن کمیٹی کے مرکزی ممبر، جنہوں نے مصاحف عثمانیہ کی تحریر کا کام سرانجام دیا تھا، بعض ایسی قراءات کے نمائندہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، جو اس متن سے مختلف ہیں جس کو انہوں نے خلیفہ کے حکم سے اختیار کیا تھا۔''

تجزیہ

تدوینِ مصاحف عثمانیہ کمیٹی کے مرکزی ممبر سے گولڈ زیہر کا اشارہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف ہے کہ وہ فرمان الٰہی: ﴿هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (یونس: 22) کو یاء کی فتح (زبر)، اس کے بعد نون ساکن اور اس کے بعد شین کی پیش کے ساتھ "يَنْشُرُكُمْ" پڑھتے ہیں، جو "النشر" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے، تفریق کرنا اور پھیلا دینا۔ آیت کا ترجمہ یہ ہوگا: ''وہ ذات جو تمہیں خشکی اور سمندر میں پھیلا دیتی ہے۔'' اس قراءۃ کی تائید فرمان الٰہی: ﴿فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ اور ﴿ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ﴾ سے بھی ہوتی ہے۔

یہ اہل شام کے امام عبد اللہ بن عامر رحمہ اللہ اور اہل مدینہ کے امام ابو جعفر یزید بن القعقاع رحمہ اللہ کی قراءۃ ہے۔ یہ دونوں تابعی اور قرائے عشرۃ میں سے ہیں۔ لہٰذا یہ قراءۃ متواتر اور ہر قسم کے شک وشبہ، توہین اور اعتراض سے بالاتر ہے۔ یہ قراءۃ بھی اسی طرح رسم عثمانی کی متحمل ہے، جس طرح باقی قرائے عشرۃ کی قراءۃ "يُسَيِّرُكُمْ" رسم عثمانی کی متحمل ہے، کیونکہ رسم عثمانی کو نقطوں اور اعراب سے خالی رکھا گیا تھا، تاکہ تمام قراءات متواترہ اس میں سما سکیں۔ لہٰذا گولڈ زیہر کا اس قراءۃ کو متن قرآنی سے متضاد قرار دینا محض افتراء پردازی اور

جھوٹ ہے۔ جب دونوں قراءات، رسم عثمانی کے مطابق ہیں، تو پھر ان میں سے ایک کونص قرآنی کے مخالف قرار دینا چہ معنی دارد؟

گولڈ زیہر کی زہر افشانی اور اس کا ردّ:

صفحہ 49، 50 پر گولڈ زیہر کے اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''قراءت میں معتمد علیہ چیز آیت کا معنی ومفہوم ہے، مخصوص قراءت پر دلالت کرنے والا لفظ اصل مقصود نہیں ہوتا۔ معنی کی مطابقت کا خیال رکھتے ہوئے کسی بھی لفظ کے ساتھ نص کی قراءت کی جا سکتی ہے۔ ہر ہر حرف کی پابندی ضروری نہیں ہے۔''

اس سلسلے میں گولڈ زیہر نے سورۃ الفاتحہ میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءۃ: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی بجائے (أرشدنا الصراط المستقيم) سے استدلال کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف یہ اہم قول بھی منسوب ہے کہ «لقد سمعت القراء و وجدت أنهم متقاربون فاقرء وا كما علمتم ......» کہ ''میں نے قراء کو سنا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب قریب پایا ہے، لہٰذا تم ویسے ہی پڑھو، جیسے تمہیں سکھایا گیا ہے۔ قراءات کا باہمی تعلق ایسے ہی ہے جیسا ''هلم'' اور ''تعال'' کا آپس میں ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ ''عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ (متوفی 181ھ) جو روایت حدیث اور زہد و ورع میں ممتاز مقام پر فائز تھے، کے متعلق نقل کیا گیا ہے، کہ وہ پڑھتے ہوئے کسی کے لیے دہراتے نہیں تھے۔''

گولڈ زیہر کی مذکورہ باتیں سراسر جھوٹ اور حقائق سے متصادم ہیں، اس لیے کہ

- تمام علمائے اسلام اس حقیقت پر متفق ہیں کہ قرآن کریم میں مفہوم کے ساتھ ساتھ الفاظ کی پابندی بھی ضروری ہے۔ معنی ومفہوم عمل کے لیے ہے اور الفاظ کی تلاوت اجر و ثواب کے لیے ہے۔
- اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآنی مفہوم کی ترجمانی کے لیے ہر کسی کو اپنی مرضی سے الفاظ

کے انتخاب کی اجازت تھی تو پھر قرآن کریم کا یہ اعجاز کہ اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ، کا مقصد ختم ہو جائے گا۔

- اگر گولڈ زیہر کی بات درست مان لی جائے تو قرآن کریم اور حدیث قدسی کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا، حالانکہ تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ ان کے درمیان بہت فرق ہے۔ اور ایک اہم فرق یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ و معانی دونوں اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں، جبکہ حدیث قدسی کا صرف مفہوم اللہ کی طرف سے نازل ہوتا تھا، الفاظ کے انتخاب میں رسول اللہ ﷺ کو رعایت حاصل تھی۔
- اگر گولڈ زیہر کی اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر بتایئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی تدوین اور باقی ماندہ صحیفوں کو نذر آتش کرنے کا جو حکم دیا تھا، اس کا کیا جواز تھا؟

باقی جہاں تک عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب قراءۃ "أرشدنا" کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ یہ قراءۃ نہیں، بلکہ ان کی طرف سے لفظ "اهدنا" کی تفسیر ہے، جیسا کہ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے سورۃ مریم کی آیت ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ میں لفظ "وَارِدُ" کی تفسیر "داخل ہونا" سے کی ہے کہ ہر شخص جہنم میں داخل ہوگا۔

باقی رہا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول، جو گولڈ زیہر نے اپنے حق میں پیش کیا ہے تو در حقیقت یہ گولڈ زیہر کے نقطہ نظر کے خلاف ایک زبردست دلیل ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان: "كما علمتم" عین کی پیش کے ساتھ ہے، عین کی زبر کے ساتھ نہیں، جیسا کہ گولڈ زیہر کا خیال ہے۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ "میں نے قراء کو سنا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب قریب پایا ہے، اور قراءات کا باہم تعلق ایسے ہی ہے جیسا کہ "هلم" اور "تعال" کا ہے۔" بالکل حقیقت پر مبنی ہے، کیونکہ قراءات کا ایک بڑا حصہ، معنوی اعتبار سے قریب قریب ہے۔ "هلم" اور "تعال" کی طرح ان کے معنی و مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے، جیسا کہ "فتبینوا" اور "فتثبتوا" کی قراءۃ ہے۔ بلکہ اکثر قراءات معنوی اعتبار سے متفق ہیں، دو

قراءات کے الفاظ میں بظاہر فرق محسوس ہوتا ہے لیکن مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مثلاً، درج ذیل قراءات ملاحظہ کیجئے:

﴿وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الاسراء 9)، ﴿وَيَبْشُرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الکہف 2)، ﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيكُمْ﴾ (البقرہ 58)، ﴿يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ﴾ (الممتحنہ 3)، ﴿تُظْهِرُونَ﴾ (4) اور ﴿يَظَّهَّرُونَ﴾ (المجادلہ 2)

اور جن قراءات کے معانی میں اختلاف ہے، وہ اختلاف تنوع ہے، تضاد وتناقض کا اختلاف قطعاً نہیں ہے، کیونکہ کلام الٰہی میں تضاد ناممکن ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات قرآنیہ ملاحظہ کیجئے:

سورۃ النساء میں ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ (23)، سورۃ البقرۃ میں ﴿يَطْهُرْنَ﴾، اور سورۃ البقرۃ ہی میں ﴿نُنْشِزُهَا﴾ (259) ہے۔

بہرحال عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کا مقصد یہ ہے کہ قراءات قرآنیہ معنوی اعتبار سے قریب قریب ہیں۔ اور تم میں ہر شخص کو چاہیے کہ وہ قراءات کو اسی طرح پڑھے جس طرح اس نے صحیح سند کے ساتھ سیکھا ہے۔ اگر ان کا یہ مطلب ہوتا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جس لفظ کے ساتھ چاہے قراءت کرسکتا ہے، تو وہ یوں کہتے: فاقرءوا کما تختارون وتمیلون کہ ''تم اپنے رجحان کے مطابق جس طرح چاہو پڑھ لو۔'' چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول تو یہ ثابت کر رہا ہے کہ قراءات قرآنیہ میں نقل وروایت کی اتباع ضروری ہے اور اس سلسلہ میں براہ راست سماع پر اعتماد کیا جائے گا۔ اور ان کا یہ قول نظریۂ قراءت بالمعنی کے ابطال کی زبردست دلیل ہے۔

باقی جہاں تک عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے قول کا تعلق ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قاری ان حروف کے مطابق قراءت کرتا، جن کی شارع کی طرف سے اجازت ہے، تو آپ اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے۔ ابن مبارک رحمہ اللہ کے قول کو اس مفہوم پر محمول کرنے سے تمام دلائل اور نصوص شرعیہ کے درمیان مطابقت پیدا ہو جاتی

ہے، کیونکہ کوئی عقل مند یہ تصور نہیں کر سکتا کہ عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ جیسا محدث اور ورع و تقویٰ میں ممتاز انسان عدالت وثقاہت میں یگانہ روزگار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ، تابعین عظام، اور ائمہ قراء کی مخالفت کرتے ہوئے بغیر نقل و روایت کے محض اپنی مرضی اور اختیار سے قراءت کی اجازت دے گا۔

گولڈ زیہر اپنی کتاب کے صفحہ 50، 51 پر لکھتا ہے:

''قراءات میں آزادی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ یہاں مشہور متن کے خلاف ایسی قراءات بھی موجود ہیں جن کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءات ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کلام الٰہی کو اس طرز کے بغیر روایت کرنا بھی جائز ہے، جس طرز پر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل میں پہنچایا تھا۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ میں مقبول قراءۃ فاء کی پیش کے ساتھ ہے، لیکن اس کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ فاء کی زبر کے ساتھ قراءۃ: "مِنْ أَنْفَسِكُمْ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، فاطمہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی قراءۃ ہے۔ اس سلسلہ کی واضح ترین مثال یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی تھے۔ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے دین اسلام ترک کر دیا۔ پھر دوبارہ اسلام قبول کرنے کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی رہ چکے تھے۔ ان کے بارے روایت کیا گیا ہے کہ قریشیوں کے سامنے فخر سے کہا کرتے تھے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرف چاہتے پھیر دیتے تھے۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے "عزیز حکیم" لکھواتے، میں پوچھتا: کیا "علیم حکیم" لکھوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ہاں دونوں طرح درست ہے۔''

گولڈ زیہر کے اقتباس کا تجزیہ:

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قراءت قرآن میں کبھی بھی آزادی کی روش اختیار نہیں کی۔ آپ اس قراءت سے انحراف کر ہی نہیں سکتے تھے جو اللہ کی طرف سے بذریعہ جبریل امین علیہ السلام آپ پر نازل کی گئی تھی، کیونکہ آپ ﷺ کا مشن ہی یہی تھا کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے وحی کیا گیا ہے، اسے بغیر کسی کمی بیشی کے من وعن انسانیت تک پہنچا دیا جائے۔ سورۃ یونس میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بارے میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ﴾

''اے محمد ﷺ، ان سے کہو، میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر وتبدل کر لوں، میں بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔''

نیز یہ بھی غلط طرز فکر ہے کہ ایک مخصوص قراءت رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو اور اس بنیاد پر کہہ دیا جائے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی قراءت ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ دیگر قراءات کو آپ ﷺ نے نہیں پڑھا، اور وہ آپ ﷺ سے منقول نہیں ہیں، حالانکہ تمام قراءات متواترہ ومشہورہ اور دیگر قراءات جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہیں، آپ ﷺ نے ان کو پڑھا ہے اور اسی حوالے سے وہ قراءات آپ ﷺ سے نقل ہوئی ہیں۔

نبی ﷺ کے حوالے سے تمام قراءات برابر ہیں، ان کا سرچشمہ اور منبع آپ ﷺ کی ذات ہے۔ وہ آپ ﷺ ہی سے لی گئی ہیں اور سب کی نسبت آپ ﷺ ہی کی طرف ہوگی۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ام المومنین یا کسی اور صحابی رضی اللہ عنہ کی طرف کوئی مخصوص قراءۃ اس بنیاد پر منسوب کر دی جائے کہ انہوں نے اس کا التزام کیا ہے یا بکثرت اسے پڑھا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قراءات کے حوالے سے اس قسم کی نسبت درست نہیں ہے، کیونکہ کسی صحیح بلکہ ضعیف حدیث سے بھی ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے تلاوت قرآن

میں کسی مخصوص قراءت کا التزام کیا ہو اور کثرت کے ساتھ اسے پڑھا ہو۔

اور جہاں تک فاء کی زبر کے ساتھ "أنفَسكم" کی قراءۃ کا تعلق ہے، تو اگرچہ اس کا مفہوم درست ہے، لیکن یہ قراءت تواتر یا مشہور ذریعہ سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا قرائے عشرۃ میں سے کسی نے بھی اس کو نہیں پڑھا۔

اور رہا عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو اس کے خود ساختہ ہونے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی اس دور کی داستان ہے جبکہ وہ مرتد ہو چکا تھا اور اسلام و قرآن کا دشمن تھا ❶ آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا اسلام کے ایک کٹر دشمن کی بات اسلام ہی کے خلاف بطور حوالہ پیش کرنا بددیانتی کا مظہر نہیں ہے؟

گولڈ زیہر کا خیالِ خام اور اس کا تجزیہ

اپنی کتاب کے صفحہ 52 پر گولڈ زیہر نے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''سورۃ الواقعہ کی آیت 26 میں جنت کی نعمتوں کے تذکرہ میں یہ بیان ہوا ہے کہ اصحاب یمین کو "الطلح" کی نعمت سے نوازا جائے گا۔ لیکن یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "الطلح" کیا چیز ہے؟ یہ درحقیقت ﴿طلع منضود﴾ ہے اور بطور تائید انہوں نے سورہ الشعراء کی آیت 148 ﴿وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ﴾ پڑھی۔ اس پر حاضرین نے کہا: کیا آپ قرآن کریم کو مذکورہ معنی کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: إن القرآن لا يهاج اليوم ولا يحول۔ آج قرآن کو نہ کہیں پھیرا جا سکتا ہے نہ اس میں کسی قسم کا اضطراب پیدا کیا جا سکتا ہے۔'' ❷

تجزیہ:

اس واقعہ سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو سبقتِ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریبی تعلق سے بہرہ مند، قرآنی اسرار و مقاصد کے

❶ عبداللہ بن ابی سرح مرتد ہونے کے بعد دوبارہ پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ ❷ تفسیر الطبری: 93/27.

شناور اور کتاب اللہ کے بارے میں غیرت ایمانی سے سرشار تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد قرآن میں ایک جملہ یا کلمہ بلکہ ایک حرف کی تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کیا، باوجودیکہ ان کے نزدیک "طلح" کی قراءت عین کے ساتھ "طلع" بھی ممکن ہو سکتی تھی کہ اس کی نظیر اللہ کے قول ﴿وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ﴾ میں موجود ہے۔

اور ان کا یہ فرمان: إن القرآن لا يهاج اليوم ولا يحوّل "آج قرآن کو بدلا جا سکتا ہے نہ اس میں کسی قسم کا اضطراب پیدا کیا جا سکتا ہے"، اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ قراءات کا سراسر انحصار نقل وسماع پر ہے اور قراءات کے معاملے میں ذاتی پسند وناپسند کی آزادی قطعاً گوارا نہیں ہے۔ یہ واقعہ تو مصنف موصوف کے خلاف دلیل بن رہا ہے، مصنف کا اسے اپنے حق میں استعمال کرنا عجیب حرکت ہے۔

حدیث "سبعة احرف" کے متعلق گولڈ زیہر کی رائے کا تجزیہ:

گولڈ زیہر اپنی کتاب کے صفحہ 53 پر لکھتا ہے:

"حدیث: ((أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ)) کے صحیح مفہوم کے بارے میں خود علمائے اسلام کوئی واضح موقف اختیار کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس کی تفسیر میں 35 آراء ذکر کی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا اختلاف قراءات کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔"

تجزیہ: ...... گولڈ زیہر کی یہ بات کہ "اس حدیث کا اختلاف قراءات کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔" انتہائی تعجب انگیز اور حیرتناک ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیے! قراءات قرآنیہ کی اصل بنیاد اور مرکز ومحور یہی حدیث ہی تو ہے۔ اور یہ ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ اس پر تمام علمائے اسلام کا اجماع ہے۔ امت مسلمہ کے درمیان اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس واضح حقیقت کے باوجود گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ اس کا اختلاف قراءات سے کوئی تعلق نہیں ہے، بہت بڑا جھوٹ ہے۔ پھر یہاں گولڈ زیہر کے بیان میں واضح تضاد کی نشان دہی ہوتی ہے۔ صفحہ 53 کے شروع میں وہ خود اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں کہ

سبعہ احرف کی حدیث علم قراءات کے ثبوت کا نقطہ آغاز اور اصل بنیاد ہے۔ اور صفحہ 54 پر گولڈ زیہر نے خود یہ مانا ہے کہ جب قرآنی متن کی قراءت کے سلسلے میں اختلافات رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیے گئے تو آپ ﷺ نے یہ بنیادی قانون جاری فرمایا کہ قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ اپنے ان دو بیانات کے درمیان گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ ''اس کا اختلاف قراءات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' فکری تضاد کی واضح مثال ہے۔

اپنی کتاب کے صفحہ 54 پر گولڈ زیہر نے یہ لکھا ہے کہ

''سبعہ احرف کی حدیث جو معتبر کتب سنہ میں بیان ہوئی ہے، اگر اسے مذکورہ بالا معانی پر محمول کرتے ہوئے اختلاف قراءات کی دلیل بنایا بھی جائے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم جن حروف پر نازل ہوا ہے، وہ مخصوص طور پر سات ہی ہیں، بلکہ اس سے مراد کثرت ہے کہ قرآن کریم بہت سے طریقوں پر نازل ہوا ہے۔ اور کلام الٰہی اور اعجاز کے اعتبار سے ہر طریقہ دوسرے طریقے کے بالکل مماثل ہے۔ اگرچہ ابو عبید القاسم بن سلام رحمہ اللہ جیسے محققین نے اس روایت کو شاذ اور غیر مستند قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔''

گولڈ زیہر نے یہاں دو دعوے کیے ہیں:

پہلا دعویٰ: کہ سات کے عدد سے حقیقت مراد نہیں ہے، بلکہ کثرت مراد ہے اور قرآن کریم کے سات حروف پر نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم بہت سے طریقوں اور قراءات پر نازل ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی نیا موقف نہیں ہے، بلکہ گولڈ زیہر سے بہت پہلے بعض علماء نے حدیث سبعہ احرف سے یہی مفہوم مراد لیا ہے۔ چنانچہ امام ابن الجزری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''النشر فی القراءات العشر'' میں لکھا ہے:

''یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں سات کے عدد سے اس کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے، کہ اس میں کمی بیشی نہ ہو سکتی ہو، بلکہ وسعت اور آسانی مراد ہے۔ یعنی لغات عرب میں سے کسی بھی لغت کے مطابق پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی

اجازت دی ہے۔ اور اہل عرب سات، ستر اور سات سو کے الفاظ کو مطلق استعمال کرتے ہیں اور ان اعداد کی حقیقت مراد نہیں لیتے کہ ان میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جا سکے۔ بلکہ وہ بغیر کسی تعیین کے اسے کثرت اور مبالغہ پر محمول کرتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی حدیث اس مفہوم کو ماننے سے ابا کر رہی ہے۔ متعدد روایات سے یہ ثابت ہے کہ جبریل امین علیہ السلام جب آپ ﷺ کے پاس ایک حرف لے کر آئے تو میکائیل علیہ السلام نے ان سے کہا: اس میں اضافہ کا مطالبہ کیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ سے اپنی امت پر آسانی کی استدعا کی۔ جس پر جبریل علیہ السلام دو حرف لے کر آئے تو میکائیل نے ان سے کہا: ان میں اور اضافہ کا مطالبہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے آسانی کی درخواست کریں۔ جس پر قرآن کریم کو تین حروف پر پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔ مسلسل تکرار کے بعد بالآخر حروف کی تعداد سات تک بڑھا دی گئی۔ اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے میکائیل کی طرف دیکھا، لیکن وہ خاموش رہے تو میں جان گیا کہ معاملہ سات پر ختم ہو گیا ہے۔''

اس حدیث سے یہ حقیقت مبرہن ہو جاتی ہے کہ یہاں سات کا مخصوص عدد ہی مراد ہے، کثرت مراد نہیں ہے۔

گولڈ زیہر کا دوسرا دعویٰ کہ ابو عبید القاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اس روایت کو شاذ اور غیر مستند قرار دے کر مسترد کر دیا ہے، سراسر باطل اور ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ کی ذات پر بدترین بہتان ہے۔ ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے نہ صرف اس حدیث کو صحیح و مشہور کہا ہے بلکہ واضح طور پر اسے متواتر قرار دیا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں، محقق ابن جزری رحمہ اللہ نے النشر میں، امام سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان فی علوم القرآن اور تدریب الراوی میں اور ان کے علاوہ تمام علماء نے قاسم بن سلام رحمہ اللہ کی اس تصریح کو نقل کیا ہے۔

اپنی کتاب کے صفحہ 62 پر گولڈ زیہر لکھتے ہیں:

''متکلمین نے خاص طور پر قرآنی نص کے بارے میں کسی حد بندی کو پسند نہیں کیا۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ایک قراءت اور حرف، عربی قواعد کی رو سے درست ہے تو اس کے ثبوت کے لیے رائے اور اجتہاد کو کام میں لانا بھی جائز ہے، قطع نظر اس سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پڑھا ہے یا نہیں۔''

گولڈ زیہر کی بد دیانتی کا تجزیہ:

میں یہ سمجھتا ہوں کہ گولڈ زیہر کی اس تحقیقی تگ و تاز کا مقصد حق کی جستجو ہے نہ ہی اس نے آراء کو نقل کرنے میں دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ گولڈ زیہر نے مذکورہ عبارت سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شاید تمام متکلمین کی رائے یہی ہے، حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے، بلکہ یہ متکلمین میں سے صرف چند لوگوں کا خیال ہے۔ جمہور متکلمین نے اس رائے کو سختی سے رد کر دیا ہے اور اس خیال کے حاملین کی غلطی کو واضح کیا ہے۔ اور دیگر علمائے حق کی طرح ان کا نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ کوئی بھی قراءت محض اس بنیاد پر قرآن قرار نہیں پا سکتی کہ وہ مشہور یا عربی قواعد کی رو سے درست ہے، بلکہ اس کے قرآن ہونے کے لیے شرط ہے کہ وہ بذریعہ تواتر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو۔ جمہور متکلمین اسلام نے قراءات کا تمام تر انحصار نقل و روایت اور براہ راست سماع کو ہی قرار دیا ہے۔

کتاب کے صفحہ 65، 66 پر درج گولڈ زیہر کے اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''علمائے دین اس بات کو ناپسند سمجھتے تھے کہ عربی زبان کے ماہرین قرآن کریم کی نصوص میں کسی قسم کی دخل اندازی کریں۔ حالانکہ انہوں نے بغیر کسی ترمیم کے قرآن کے مشکل مقامات کو درست کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ پھر بھی عموماً انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق قرآنی متن میں کسی قسم کی ترمیم کر سکیں، جیسا کہ مخصوص قراء کو اس کی عام اجازت تھی۔ زمانہ قدیم میں بعض ایسی قراءات کا اعتراف بھی سامنے آیا ہے جو باریک نحوی قواعد اور ان کے مخالف بعض الفاظ و جملوں کے درمیان مطابقت اور ہم

آہنگی پیدا کرنے کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئیں۔ اس کی ایک مثال سورۃ الحجرات کی آیت 9: ﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ ہے۔ یہاں "اقْتَتَلُوا" میں جمع مذکر کی ضمیر تثنیہ مونث "طائفتان" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض قراء نے یہ چاہا کہ اسے نحوی قواعد کے مطابق ہونا چاہیے، چنانچہ ان میں سے ایک قاری ابن ابی عبلہ نے اسے "اقْتَتَلَتَا" پڑھا اور عبید بن عمیر نے اسے "اقْتَتَلَا" پڑھا۔" ......انتھی

اس اقتباس میں گولڈ زیہر کا یہ جملہ کہ "بعض ایسی قراءات کا اعتراف بھی سامنے آیا ہے جو باریک نحوی قواعد اور ان کے مخالف بعض الفاظ وجملوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئیں۔" اور پھر سورۃ الحجرات کی آیت کو بطور مثال پیش کرنا، قابل ملاحظہ ہے۔ یہاں گولڈ زیہر یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ مذکورہ آیت کریمہ نحوی قواعد کے خلاف ہے، کیونکہ یہاں "اقْتَتَلُوا" میں جمع مذکر کی ضمیر، تثنیہ مونث "طائفتان" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حالانکہ عربی گرائمر کی رو سے "اقْتَتَلُوا" کی بجائے "اقْتَتَلَتَا" یا "اقْتَتَلَا" ہونا چاہیے تھا، تاکہ تثنیہ کی طرف تثنیہ کی ضمیر ہی لوٹائی جا سکے۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ کوئی ایسی قراءت اختراع کی جائے جس سے عربی گرائمر اور قرآنی الفاظ کے درمیان ہم آہنگی کی صورت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ابن ابی عبلہ نے "طائفتان" کے لفظ کی مناسبت سے "اقْتَتَلَتَا" کی قراءت وضع کی اور زید بن علی اور عبید بن عمیر نے "طائفتان" کے مفہوم کی مناسبت سے، یعنی طائفہ کو فریق کے معنی میں لیتے ہوئے "اقْتَتَلَا" کی قراءت اختراع کی۔ یہ گولڈ زیہر کی گفتگو کا خلاصہ تھا، اب اس پر ہمارا تجزیہ ملاحظہ ہو:

ہم بارہا یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ نحو کے قواعد قراءات کے تابع ہیں، قراءات قرآنیہ قواعد نحویہ کے تابع نہیں ہیں، کیونکہ قرآن کریم اپنی تمام تر قراءات وروایات سمیت فصیح ترین عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو اس وقت جزیرہ عرب کی عام زبان تھی۔ اور قواعد نحویہ کا ماخذ یہی کلام عرب ہے جو نظم ونثر پر مشتمل ہے یا پھر ان کا اہم ترین ماخذ قرآن کریم

اور سنت نبویہ ﷺ کا ذخیرہ ہے۔ عربی گرامر کے تمام تر اصول وقواعد قرآن کریم، احادیث نبویہ ﷺ اور اس کے بعد کلامِ عرب کو سامنے رکھ کر اخذ کیے گئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم اصل ہے اور نحوی قواعد اس کی فرع ہیں اور فرع کو بنیاد بنا کر اصل پر اعتراض نہیں کیا جاتا اور خود گولڈ زیہر نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب کے صفحہ 68 پر لکھا ہے کہ صحیح عربی زبان کے استعمال میں قرآن کریم کو گرامر کے اصولوں پر برتری حاصل ہوگی مگر گرامر کے اصولوں کو قرآن کریم پر فوقیت نہیں دی جائے گی۔ یہ اس کی طرف سے اس حقیقت کا واضح اعتراف ہے کہ عربی زبان کے مختلف اسالیب قرآن کریم کے تابع ہیں، قرآن کریم عربی اسالیب کے تابع نہیں ہے۔

اور مذکورہ آیتِ کریمہ بھی درحقیقت اپنے اسلوب اور ترکیب میں فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ "طائفتان" یہ "طائفة" کا مثنیہ ہے اور گروہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک گروہ بہت زیادہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ تو "طائفتان" یہاں قوم اور افراد کے معنی میں ہے، لہٰذا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اس کے لیے فعل بھی واو جمع کے ساتھ "اقتتلوا" استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے برعکس ﴿فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ میں مثنیہ کی ضمیر لا کر لفظ کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس فرق کا راز، یعنی پہلے جملے میں لفظ اور دوسرے میں معنی کی رعایت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بحالت جنگ دونوں گروہ باہم یوں خلط ملط ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان امتیاز کرنا ممکن نہیں ہوتا (یعنی دونوں گروہوں کا ہر ہر فرد جنگ میں شریک ہوتا ہے۔) لہٰذا مناسب تھا کہ معنی کی رعایت کرتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال کیا جائے۔ اس کے برعکس صلح کی صورت میں دونوں گروہ ایک دوسرے سے علیحدہ اور الگ ہوتے ہیں (یعنی اس میں صلح کرتے ہوئے گروہ کے ہر ہر فرد کی بجائے دونوں طرف سے نمائندے شریک ہوتے ہیں) لہٰذا مناسب تھا کہ یہاں معنی کی بجائے لفظ کی رعایت کرتے ہوئے مثنیہ کی ضمیر استعمال کی جاتی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ آیتِ کریمہ اسلوب کی ندرت، جملے کی در و بست اور معنی کی بلندی کے اعتبار سے فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔

خاتمہ

گولڈ زیہر کے رد میں ہماری گزارشات ختم ہوئیں۔ اس نے اپنی کتاب "مذاهب التفسیر الاسلامی" میں جن بدیانتیوں کا ارتکاب کیا ہے، ہم نے انہیں بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ کتاب ایک پیغام ہے ہر اس شخص کے لیے جو حق کا جویا اور راہ راست کا متلاشی ہے۔ اس میں الحمد للہ! گولڈ زیہر کے پس پردہ عزائم، اس کے نظریات کا لچر پن، آراء کی غیر معقولیت اور اس کے افکار کی لغویت کو بڑی وضاحت سے پیش کر دیا گیا ہے۔ اور اللہ کے فضل سے ایسے دلائل و براہین جمع کر دیئے گئے ہیں کہ گولڈ زیہر کی کتاب کے بخیے ایک ایک کر کے ادھڑ گئے ہیں۔ اس کی ہفوات ہوا ہو چکیں، اور اس کی سخن سازیاں ایسی بے حقیقت اور باطل ٹھہرا دی گئی ہیں کہ اس کے کئے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور فرمان الٰہی: ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ﴾ کہ "جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے نفع بخش ہے، وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔" کے مصداق یہ ایک ایسی بے بنیاد چیز رہ گئی ہے کہ جس کی دیواریں اب گر چکیں اور اس کے ستون ڈھے چکے ہیں۔

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ٥﴾ (آل عمران: 8)

"اے ہمارے رب، جب تو ہمیں ہدایت دے چکا تو اب ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کرنا، ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر، بلاشبہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔"

﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ٥﴾ (ابراھیم: 27)

"ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت دونوں میں ثابت قدمی عطا کرتا ہے۔ اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے، اور اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔"

درود و سلام ہو ہمارے آقا محمد ﷺ پر اور آپ کی آل پر۔ اللہ تعالیٰ آپ کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پر راضی ہو چکا۔ سب تعریفات اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

محترم قارئین کرام!

جناب مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«يذهب الصالحون الأول فالأول، ويبقى حفالة كحفالة الشعير أو التمر، لا يباليهم الله بالة» "نیک لوگ یکے بعد دیگرے رخصت ہو جائیں گے اور ردی کھجوروں یا جو کے بھوسے کی طرح بے کار لوگ باقی رہ جائیں گے، جن کی اللہ کو کوئی پروا نہیں ہوگی۔"

(صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب ذهاب الصالحين، رقم الحديث: ٦٤٣٤)

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ:

- خالص قرآن و حدیث کے مطابق اور منہج نبوی ﷺ پر آپ کے بچوں کی تربیت ہو۔
- کتاب و سنت کی روشنی میں کھلنے پھولنے والے افراد تیار ہو کر معاشرے کو روحانی رنگ دیں اور اسلامی تہذیب کے امین بن جائیں۔
- مسلمان عناد و تعصب اور دیگر خرافات سے دور ہو کر محبت اور یگانگت سے متحد ہو جائیں اور ان کو اسلامی افکار سے آشنا کیا جائے۔
- اسلام کے خلاف جملہ فتنوں کی بیخ کنی اور سرکوبی ہو اور حق کا بول بالا ہو۔
- اکناف عالم و اقطار الارض میں پھیلی ہوئی امت محمدی ﷺ کو صحیح تعلیم و تربیت و تبلیغ کے ساتھ صحیح عقیدہ و عبادات کا علم اور اس کی اہمیت کا علم ہو۔

تو آیئے! رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ادارے کے ہم رکاب ہو کر دینی حمیت و اخوت کا ثبوت دیں تاکہ امت مسلمہ اپنا کھویا ہوا مقام و وقار حاصل کر سکے۔

والله المستعان وبه الثقة وعليه التكلان

كلية القرآن الكريم والتربية الإسلامية

[illegible]

الہ آباد ... ضلع قصور

Phone: 049-4513116 Mob: 0333-4358421, 0333-4296679

Fax: 049-4513115 Mob: 0333-4084583, 0300-4306893

www.quraancollege.com Email.quraancollege@hotmail.com